تلخ حقیقتوں پر مبنی ایک ناول



رفعت

آنگن ہوا پردیس

ایک ڈائری سے ماخذ ناول

آنگن ہوا پردیس

رفعت

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز

لاہور ــــــ حیدرآباد ــــــ کراچی

طابع ... شیخ نیاز احمد
مطبع ... غلام علی پبلشرز
قیمت ... چار روپے ۵۰ پیسے

مقام اشاعت
شیخ غلام علی اینڈ سنز ۔ پبلشرز
ادبی مارکیٹ ۔ چوک انار کلی ۔ لاہور

پیاری بہن ریحانہ
یہ صرف پڑھنے کے لیے
نہیں، بلکہ اسی پر
پوری طرح تبصرہ بھی
درکار ہے۔ شکریہ۔
ایک [illegible] جنہ
۱۹۷۵

مسائل میں الجھی
روایات میں جکڑی
حالات سے نبرد آزما
بے وطن کنواریوں
کے نام۔

(رفعت)

کیسری

جامنی

مونگیا

دروازے میں لگے گہرے گہرے رنگوں کے شیشوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ اور ان رنگوں کا عکس ممتاز کے سراپا کو رنگین کر رہا تھا۔

یہ میرا ہاتھ کیسا پیلا پیلا سا ہو رہا ہے۔ جیسے برسوں سے کسی ٹی۔ بی وارڈ میں خون تھوکتے تھوکتے یہ حال ہو گیا ہو۔ اور اس کی پیلاہٹ میں یہ سبز رنگ کی آمیزش —— مگر میرے پاؤں کیسری ہیں۔ اور ظاہر ہے۔ چہرے پہ جامنی رنگ کانپ رہا ہوگا۔

انسان بھی تو اسی طرح کتنے رنگوں سے بنا ہوا ہے۔ مگر ہر انسان کے دو روپ ہیں۔ ظاہری اور باطنی رنگ بھی اسی طرح ہوں گے۔ داخلی اور خارجی۔ کئی بار داخلی رنگ اتنے تیز اور شوخ ہوتے ہیں۔ کہ بیرونی رنگ بے حد پھیکے پھیکے لگنے لگتے ہیں۔ اور کئی بار باہر کے رنگ چیختے چلاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اندر کے رنگ جیسے گونگے ہو جاتے ہیں۔ مگر میں کن رنگوں سے بنی ہوں۔ میرے کونسے رنگ بولتے ہیں اور کونسے گونگے ہیں۔ میں یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتی۔

تم نے اپنے شیش محل میں یہ رنگین شیشے جڑتے ہوئے جانے کیا سوچا ہوگا۔ تم جو شیل، سمترا، ہر بجن کور یا راملا دیوی — رہی ہوں گی (جانے تمہیں کس نام سے پکارا جاتا ہوگا) اور یہاں ان کے جھلملاتے ہوئے عکس میں نہاتے ہوئے جانے تم نے کیا کچھ سوچا ہوگا۔ جانے کیسے کیسے ارمان جگائے ہوں گے۔ اور اسی پلنگ پر (اگر یہ پلنگ جس میں ننھے منے رنگین شیشے اور سفید آئینے لگے ہیں۔ جس کے چوبی تکیے پر پتیل کے مور بنے ہیں) آڑا آڑا لیٹ کر جانے کیا سوچا ہوگا۔ مگر جانے یہ پلنگ یہاں ہی بچھا تھا یا اب رکھا گیا ہے۔

اور آج کا مؤرخ جسے یوں لکھے گا۔

"اور اس چوبی پلنگ پر بے حد اداس لڑکی
بیٹھی تھی۔ جس کے چہرے پر ان گنت سوچیں
لہرا رہی تھیں۔

سوچیں ——
جن میں حسین ماضی کا عکس تھا۔
مستقبل کا اندیشہ تھا۔

اور گذرتے وقت کی آہٹ تو جیسے جم کر رہ گئی تھی۔ جیسے یہاں سے آگے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا پاتی۔ کہ آگے دروازہ بند ہے۔ اور وہ دھیرے دھیرے یہاں ہی کھڑی دستک دے رہی ہے۔

مجھے جانے دو۔
مجھے آگے بڑھنے دو۔
مجھے دور جانا ہے۔

مگر راہوں پر خون آلود کانٹے بکھرے ہیں۔ اور سوچ اس معصوم دوشیزہ کے اداس چہرے پر دھیرے دھیرے کانپ رہی ہے۔ جیسے دیئے کی لو مسلسل کانپتی ہے۔ اور کبھی کبھی ہوا کے بھاری جھونکے سے دوہری ہو کر ایک دم بھڑکتی ہے۔ اور پھر — — وہ قطعی نہیں بجھتی۔ بلکہ ہوا کا یہ تھپیڑا اسے تیز تر کر دیتا ہے۔ یہ سوچیں ختم نہیں ہوں گی۔ بلکہ ہر آن بڑھتی رہیں گی۔

سن۔ اے اداس لڑکی!

پلنگ پر اور بھی آڑا زاویہ بناتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ سوچوں کی گھڑی نہیں بی بی۔ سوچا تو وہاں جاتا ہے جہاں کچھ وقت باقی ہو۔ اور پھر بیکار ذہن یہ تاویلیں پیش کرتا ہے۔ کہ یوں نہیں یوں ہوگا۔ یہ ٹھیک رہے گا۔ ایسا ہو جائے گا تو زندگی سنور جائے گی۔ مگر اب تو نبھانے کا وقت ہے۔ بلکہ نبھانے سے بڑھ کر اپنے آپ کو ڈھالنے کا۔ اس وقت بہتری اسی میں ہے کہ حالات سے مطابقت کی جائے۔ حالات کیا کہتے کیا چاہتے ہیں۔ غور کرو۔

تم نے بائیس برس تک کچھ چاہا تھا۔ تم جو اپنے گھرانے کی ذہین لڑکی تھیں — دھتیں — توبہ' ارے تھی ہو،

تم سے ملک، ہسٹری، شہر اور گھر تو چھینا جا سکتا ہے۔ ذہانت نہیں)۔ ہاں تم جو مدرستہ البنات کے جلسہ میں :۔

ملت ہے فوج' فوج کا سردار ہے جناح

اسلامیانِ ہند کا سردار ہے جناح

اتنے جوش سے پڑھتی ہو۔ کہ تمہاری آواز تالیوں کے شور میں ڈوب جاتی

ابھرتی رہتی ہے - اور تم فاطمہ بیگم کو اپنی ہر قسم کی اعانت کا یقین دلاتی ہو - اور پھلور میں "پیسہ ممبر شپ" کی تحریک چلاتی ہو - اپنے محلے میں اپنے علاقے میں تم پڑھی لکھی لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ باشعور کارکن بھی ہو اور اپنے محلے کی زنانہ مسلم لیگ شاخ کی سیکرٹری ہو - لاہور سے آنے والے خواتین کے وفد کا استقبال کرتی ہو - اور انہیں اپنے شہر کی سرگرمیوں سے آگاہ کرتی ہو - اور بار بار سنتی ہو -

"اس وقت ہمیں ایسی ہی مسلمان بچیوں کی ضرورت ہے - ایک وقت تک انگریز اور ہندو کی ملی بھگت سے ایسا تعلیمی نصاب رائج رہا ہے - کہ ہماری بچیاں تعلیم حاصل نہ کر سکیں - انگریز کا خیال تھا کہ تحریک آزادی میں ہم لوگ شکست کھا جائیں گے - مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ہماری مسلمان بچیاں کم ہی پڑھیں - مگر اپنی ضرورت کی اہمیت سے آگاہ ہیں - ہماری لڑکیاں باشعور ہیں - حالات و وقت کا احساس رکھتی ہیں - اور ہمیں خوشی ہے - کہ اس معرکے میں وہ اہم کردار ادا کر رہی ہیں -

مدرستہ البنات کے بانی آغا جی ہر روز اپنی تقریر میں ان مٹھی بھر مسلمان بچیوں کا حوصلہ بڑھاتے - اور اپنی بیٹی حمیدہ بیگم سے کہتے :-

یہ سکول جو قوم کی بچیوں کو اپنی تعلیم دینے کے لیے شروع کیا گیا ہے - دیکھ لینا ایک دن علی گڑھ یونیورسٹی کا روپ دھار لے گا - لاہور میں انجمن حمایت اسلام نے کام کیا ہے - یا جالندھر کے علاقے میں ہم نے

خواتین کے لیے کیا ہے"۔

اس وقت میں نے سوچا تھا۔ کہ جب میں لاہور جاؤں گی۔ تو مجھے اسلامیہ کالج میں داخلہ مل جائے گا۔ اور فاطمہ بیگم لاہور کی خواتین سے میرا تعارف یوں کروائیں گی۔

سیکرٹریٹ پر اگر فاطمہ صغرا نے پاکستان کا پرچم لگایا تھا۔ تو ہماری اس جوشیلی لڑکی نے جالندھر میں کم خدمت نہیں کی۔ پاکستان کا عالم وجود میں آنا ایسے ہی افراد کی محنت کا نتیجہ ہے۔

پاکستان ـــــــ ... اس نے اوندھے لیٹ کر اپنے پاؤں پر پاؤں رکھا۔

اے جوشیلی لڑکی۔ پاکستان میں آکر تیرا جوش دھیرے دھیرے یوں نچڑ گیا۔ گویا تیرا باطن اسفنج کا گیلا ٹکڑا تھا۔ جسے حالات کے تھپیڑوں نے اس شدت سے دبایا کہ اس میں سے قطرہ قطرہ نچڑ گیا۔ وہ بھی تو حالات کا ایسا ہی تھپیڑ تھا۔ جب وہ اپنے پھٹے ہوئے سیاہ برقعے کو اوڑھے پیسہ اخبار سٹریٹ کی تاریخی حویلی میں داخل ہوئی تھی۔ اور فاطمہ بیگم سے اپنی خدمت کی داد طلب کی۔ تو انہوں نے کمال شفقت سے کہا۔

"آپ کی خدمت کا اعتراف تو تاریخ نے کر لیا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ اب آپ کے ذمہ اس کی ترقی اور آبیاری ہے۔ میں نواں کوٹ میں ایک کالج کھولنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ایک ہائی سکول بھی۔ آپ اپنی تعلیم مکمل کر لیجئے۔ پاکستان

کو مخلص کارکنوں کی اب زیادہ ضرورت ہے۔ ہماری اکثر خواتین کی تعلیم گذشتہ جہالت کا ردعمل تھی۔ اس لیے عورتوں نے اپنی تعلیم کا مقصد یہ لیا کہ آزاد پھرا جائے۔ ان کے مرد بیرونی ملک سے پڑھی لکھی عورتیں بیاہ کر نہ لائیں۔ بلکہ وہ خود ایسی بن جائیں جیسا مرد چاہتے ہیں۔ اور جب عورت اپنے آپ میں محو ہو تو پھر گھر کی پرواہ نہیں کرتی۔ سوٹ بوٹ پہن کر تو اولاد اپنے بزرگوں کو دقیانوسی کہہ کر ان سے عزیزداری تسلیم نہیں کرتی۔ بھلا یہ عورتیں اس ملک کو اپنی ماں اپنا محافظ کیسے مان لیں گی۔ اس لیے بی بی اب قائداعظم کی موت کے بعد اس یتیم ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے ایثار پیشہ مخلص باشعور کارکن خواتین کی بہت ضرورت ہے۔

میں بیگم جی۔ لے خاں اور بیگم تصدق حسین سے بھی بات کروں گی ویسے یہ بتاؤ۔ آپ لوگوں کو رہنے کے لیے مکان تو اچھا مل گیا؟ سامان تھا اس میں کچھ —— دیکھئے بی بی۔ یہاں تو ابھی تک ہزاروں مہاجر بے گھر ہیں۔ اور ہمارا سب سے بڑا کام اپنی ہزاروں اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی ہے۔ آج کل ہماری بیگم اسحاق بہت کام کر رہی ہیں وہ ہندوستان جا کر مغویہ عورتوں کے کیمپوں میں تقریریں کرتی ہیں۔ اللہ معاف کرے۔ ہماری لڑکیوں میں دینی تعلیم کی کس قدر کمی ہے۔ کہ وہاں وہ خاوند، بچے، زیور، کپڑا پا کر یہاں آنے کا نام نہیں لیتیں۔ ویسے ان کا یہ خیال بھی ہے۔ کہ شاید انہیں یہاں ان کے عزیز قبول نہ کریں۔

اس لیے اکثر لڑکیاں اپنا نام پتہ غلط بتاتی ہیں۔ یا والدین کا نام ہی نہیں بتاتیں۔

ہاں بیٹی ــــ تو دکھی نہ ہو۔ میں تو چاہتی ہوں۔ اپنی ایک ایک کارکن کو مالا مال کر دوں۔ مگر تمہیں کیا بتاؤں۔ یہاں تو وہ خواتین آگے بڑھ رہی ہیں جو یونینسٹ حکومت کی جی حضوریوں میں تھیں۔ وہ اپنے دامن یوں پھیلا رہی ہیں۔ گویا پاکستان کی تعمیر میں ان کا خون پسینہ استعمال ہوا ہے۔ اکثر بڑے بڑے لوگ اپنے گھروں کو متروکہ سامان سے بھرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ جو جگہ جگہ بیت المال کھل گئے ہیں۔ بس ان میں اندھے کی ریوڑیوں کی بندر بانٹ ہو رہی ہے۔ رشوت زوروں پر ہے ــــ ہائے ــــ ایسا پاکستان تو ہم نے نہیں سوچا تھا ــــ

تب گھر پلٹ کر اس جوشیلی لڑکی نے بڑے دکھ سے سوچا تھا۔ یہ گھر میں چھوٹے چھوٹے بہن بھائی اور نئے نئے حالات۔ یہاں نہ پڑھنے کا وقت ہے۔ نہ کچھ کر گذرنے کا۔ اماں تو ایک ایک پل سوچتی ہیں۔ جوان لڑکی اب کتنی دیر گھر میں بٹھاؤں گی۔ وہاں سکول میں تھی۔ سٹیج پہ تقریریں کرتی۔ نظمیں پڑھتی۔ تو اپنی برادری کے علاوہ باہر سے بھی پیغام آتے تھے۔ مگر اب تو جانے پیغام سرحد کے اس پار ہی رہ گئے یہاں تو جسے دیکھو افراتفری کے عالم میں سر چھپانے کے لیے جگہ تلاش کر رہا ہے۔ اس آبادکاری میں بھلا کہاں کی لڑکیاں۔ کہاں کے پیغام۔ یہ سب لوگ ــــ ہم سب کہیں ٹک کر بیٹھ جائیں۔ سکون ملے تو بات کریں۔ نئے لوگ۔ کسی کی ہڈی خون کا کیا اعتبار۔

اور یوں بیٹھتے اٹھتے ارادہ کرتے سوچتے زمانہ گذرتا جا رہا تھا۔ اور گذشتہ تین برس میں تو یہاں کوئی نئی بات نہ ہوئی تھی۔ نہ تو حالات میں فرق آیا ہے۔ نہ زندگی کسی نئے موڑ پر پہنچی ہے۔ اور وہ کانوں میں جو سرگوشیاں سی کی جاتی تھیں۔ اور دھیرے دھیرے کوئی احساس دلاتا تھا۔

مجھے تمہاری ضرورت ہے
تم نے وقت کے تقاضے کو سمجھا ہے۔
اے باشعور لڑکی میں تیرا منتظر ہوں۔

ظاہر ہے کوئی کسی کا انتظار کرتا ہے۔ اور اُسے میرا انتظار کرنا ہی تھا۔

کوئی —— —— !
مگر۔ کون ! ؟
وہی جو اماں کی آرزو ہے۔
جو میرا مستقبل ہے۔

بشنت، عصمت چغتائی کے افسانے پڑھنے والی لڑکی۔ تو کیوں کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ اور یہ سوچ رہی ہے۔ کہ کوئی تیرا منتظر ہے

تو —— دیکھتی نہیں۔
ایک نیا ملک تخلیق ہوا ہے۔

تو نے اپنی ہوش میں اپنے بعد آنے والے بہن بھائیوں کو دیکھا ہے۔ جب اماں ایک نئے انسان کو جنم دیتی ہے۔ تو کتنی لاغر ہو جاتی ہے۔ اور نومولود کیسا ہوتا ہے۔ گوشت کا لال لال دہکتا اس میں

نیلاہٹ بھی ہوتی ہے، نرم نرم لوتھڑا، پھر وہ دھیرے دھیرے بڑھتا ہے۔ ملک بھی تو ایسا ہی ہے۔ ہم لوگوں نے نومولود کی کتنی تیاریاں کی تھیں۔

نانی اماں نے لحاف اور رلائیاں سی تھیں۔

میں نے فراکوں پر سموکنگ بنائی تھی۔

نادرہ جھنجنا خرید لائی تھی۔

ابا ہر ایک سے اسی کی ڈیوٹیاں پوچھ پوچھ کر یقین کرتے رہتے۔ کہ پرورش تو ٹھیک ٹھاک ہو رہی ہے۔ ہم سب بڑے خلوص سے اپنا کام کرتے۔ مگر یہ ملک اس میں ابھی سے مخلص کارکنوں کی کمی محسوس کی جانے لگی ہے۔ یہاں یہ احساس کیوں ہونے لگا۔ کہ لٹیرے گھس آئے ہیں۔ یہاں ابن الوقت بڑھ رہے ہیں۔ فاطمہ بیگم بھی تو ٹھیک ہی کہتی ہیں پاکستان کو اپنے اردگرد لپیٹ کر اس سے فائدہ حاصل کرنے والے تو بہت ہیں۔ مگر پاکستان کی حفاظت کرنے والوں کی کمی ہے۔ کیا میرے مستقبل کی طرح ملک بھی ایک غیر یقینی دور میں داخل ہو رہا ہے۔

اور ایک دکھی لڑکی! تو اپنے مستقبل سے خوف زدہ ایک تحفظ کے لیے بھٹکنے لگی ہے۔ اس لیے کہ تیرے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی تعلیم میں تجھ سے بڑھنے لگے ہیں۔ اور ایک تو ہے کہ رنگوں کے اسی آئینہ خانہ میں چپ چاپ پڑی گذرتے وقت کی چاپ گن رہی ہے۔

تو کیا چاہتی ہے۔؟

تیرا مستقبل کیا ہوگا —؟

آخر تو کیا کرے گی کیا —؟

گہرا جامنی رنگ اب اس کے ہاتھوں پر کانپ رہا تھا۔ سڑک پہ فلم کے اشتہار والا تانگہ گذر رہا تھا۔ جس میں سے مسلسل ڈھول اور گھنٹی کی آوازیں آرہی تھیں۔ شور ذرا تھما۔ تو گھوڑے کی جھانجریں کہیں قریب ہی ابھریں اور تھم گئیں۔

نیچے دروازے پر دستک ہوئی۔ صحن میں کسی کی آمد کا احساس ابھرا پھر نادرہ کے قہقہے کی آواز آئی۔ پھر کوئی سیڑھیوں پہ تیز۔ تیز۔ قدم رکھتا اوپر آیا۔

حد ہو گئی بھئی ہم آئے۔ اور تم کہاں چھپی پڑی ہو۔"

اللہ ـــــ تم کیسے

(اداس لڑکی اپنی سہیلی کے گلے ملتی ہے)

کہو تم کیسے آگئیں۔ تم سب کہاں ہو بھئی۔ ہم لوگ کیسے بکھر گئے۔ کہ اب تو تم سب کو دیکھنے کو آنکھیاں ترستیاں ہیں۔

اسی لیے آگئی ہوں ہو۔ کہ جی بھر کہ تکور کر لو۔ سناؤ۔

تم کر کیا رہی ہو ـــ

حالات سے مطابقت ـــ

یعنی ۔ چہ ر

اماں کے ساتھ تمام دن خانہ داری اور پھر اس پلنگ پہ لیٹ کر۔ ماضی کی یاد ـــــ یا۔ ماتم آرزو ـــــ

انتہائی واہیات، قطعی بیکار۔ بلکہ انتہائی مایوس کن۔ بندی خدا اور کچھ نہیں بن پڑا۔ تو اپنی لیڈر خواتین سے تو مل لیا ہوتا۔

مل چکی ہوں۔ مگر وہ سب تعمیری کاموں سے ہٹ کر حصے بخرے کے

کام میں مصروف ہیں۔ اب مسلم لیگ سے ہٹ کر یا اسی میں رہ کو اپنی اپنی تنظیمیں، انجمنیں بنانے کا سوچ رہی ہیں۔ وہ اب بھی کہتی ہیں کہ انہیں باشعور پڑھی لکھی لڑکیوں کی اور مخلص کارکنوں کی ضرورت ہے۔ مگر ہمیں ماضی کی خدمات کے سلسلہ میں شکریہ پر ٹال کر آگے بڑھنے اور ترقی کا موقع اپنے عزیزوں کو دیتی ہیں۔

خیر چھوڑو۔ وہ بتاؤ گھر کے حالات۔ رحمان کیا کر رہا ہے۔

وہ تو فسٹ ایر میں ہے۔

شمشاد۔

-- میٹرک کر رہی ہے۔

اور وہ جو دو چھوٹے ہوتے تھے؟

دونوں مڈل میں ہیں۔

یعنی ماشاء اللہ تمام گھر ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔ سوائے تمہارے....

میں امی کا ہاتھ بٹا رہی ہوں۔ اگر میں سر نہ جھکاتی۔ تو ان کی ترقی دشوار ہو جاتی۔

مگر تم تو وہاں عربی فاضل کی کلاس میں تھیں۔

کر چکی تھی۔ اب تو صرف انگلش کا امتحان دینا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک آدھ اور پرچہ۔

مگر اب کیوں نہ کر لیا۔

یہاں نزدیک (only) انگلش کے لیے داخلہ نہیں۔ اور گھر میں ٹیوشن کے لیے پیسہ نہیں۔ اور بڑی بات اماں تمام دن

ذہنی طور پر پریشان رہتی ہیں۔ اس لیے اس وقت گھر کو سنبھالنا بڑا کام ہے۔

خالو جان کا کام کیسا چل رہا ہے۔؟

نلے اوپر دو کام چھوڑے ہیں۔ اور اب دکان کرلی ہے۔ جنرل مرچنٹ کی۔ اس کے لیے بھی پیسہ چاہیئے تھا۔ میں نے پہلے اپنا زیور دیا تھا۔ اب اماں کا بھی لگ گیا ہے۔ ویسے یہ ــ کہ دکان جم گئی ہے اب تم اپنی سناؤ۔ رضیہ تم نے کیا سوچا ــ

میں نے ملازمت کرلی ہے۔

ملازمت ــ

ہاں ــ بھئی حرج کیا ہے۔ اور پھر ہم تو فرض کر چکے ہیں۔ کہ ہر نیا قدم پہلے ہمارا اٹھے گا۔ کیوں کہ اپنے محلوں، اپنے گھروں۔ اپنی جماعتوں میں سب سے پہلے ہم نے جدید شعور کی نشان دہی کی تھی۔ ہم ہی نے تو اپنا قصبہ چھوڑ کر سکول کا ہوسٹل اپنایا تھا۔ اپنے گھروں اپنے خاندانوں اپنے قبیلوں میں ہم نے لڑکوں کے مقابلے میں پڑھا تھا۔ ہم اپنے دور کی نئی لڑکیاں کون نہیں جانتا۔ کہ یہ دور ہم نے تخلیق کیا ہے۔

یہ دور ہمارے ذہنوں میں سے گزر رہا ہے۔ ہمارے شعور کو مسلسل بیدار کیے ہوئے ہے۔ آؤ۔ اب اس میں اپنا رنگ بھی شامل کرلیں۔

رنگ۔ ارے بھئی۔ یہ ہمارے ہی تو رنگ کا عکس ہے۔

یہ نیلے رنگ کا عکس جو تمہارے سراپا پہ کانپ رہا ہے۔

بندی خدا! یہاں ان گہرے رنگوں کے شیشوں پر کوئی پردہ تو ڈال لیا ہوتا۔ یہ ننگے دروازے کیسے لگتے ہیں۔ ہر دم طعنہ دیتے ہوئے سے۔

شیشے تو رنگ اور روشنی برساتے ہیں۔ طعنہ تو تم نے دیا ہے ہاں یہ بتاؤ۔ تمہاری ملازمت۔

میں نے محکمہ سوت کتائی میں ملازمت کی ہے۔ اب یہاں چھ ہفتے کے کورس پر آئی ہوں۔ رہنے کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اس لیے سوچا تمہارے ہاں قیام کرلوں۔ ٹریننگ کے بعد کسی دیہات میں جانا ہوگا۔ ایک چپڑاسن ملے گی۔ ساٹھ تنخواہ اور سفر خرچ دورے کا خرچ وغیرہ علیحدہ۔

اب گھر سے قدم باہر نکال لیا ہے۔ تو بہت سی منزلوں سے گذرنا ہی پڑے گا۔ بلکہ سوچوں گی۔ تمہارے لیے بھی کچھ کام تلاش کروں۔ بیکار زندگی تو خود ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ اور ہمارے ذہنوں پر تو پہلے ہی حالات نے ناقابل انتقال بوجھ ڈال دیا ہے۔ ان کے لیے تو یہی مصروفیتوں، ملازمتوں کے دلاسے ہی کام آئیں گے۔

شیشوں کے سارے رنگ اندھیروں میں ڈوب گئے۔ تو اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا ــــ وہاں کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہی شور برپا کرتی سڑکیں۔ وہی گھر بھر میں رینگتی خاموشی۔

رضیہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ حالات کا بوجھ بانٹنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہی ہوگا ــــ دلاسے ہی سہی۔ مگر کیا کروں، میں گھر کی روایات کیسے توڑوں۔ یہاں مجھے نوکری کون دے گا۔ رضیہ نے تو گھر سے

قدم باہر نکال لیا۔ آخر کو ترقی کرے گی۔ مگر میں کیا کروں ——۰۰ اماں کا انتظار شاید بے حد تلخ صورت اختیار کرے۔ تو پھر کیا میں ان حالات کا مقابلہ کر لوں گی؟ میری زندگی تو قطعی ڈانواں ڈول ہو کر رہ جائیگی۔

مگر یہ سب کچھ میں نے اپنے لیے کب سوچا تھا۔ میرا مستقبل تو بے حد جگ مگ جگ مگ کرتا ہوا تھا۔ اور اب۔

یہ زندگی کتنی اداس، تنہا اور بوجھل ہے۔

میں نے نئے ملک کے لیے بڑے جوش سے کام کیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ تو نہیں چاہا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا۔ میری محنت، میرے خلوص کا اعتراف کیا جائے گا۔ تو مجھے کہاں کہاں سے داد ملے گی۔ اور میری زندگی کتنی سہل، کتنی حسین، کتنی بھرپور ہو گی۔

مگر یہ سب کچھ کیا ہے میرے خدا ——

یہاں تو اپنے آپ کو دلاسا دیتے ہوئے بھی خوف آنے لگا ہے۔

میں نے ایسا تو کبھی بھی نہ سوچا تھا۔

بہر حال مجھے کچھ کرنا ہی چاہیئے۔

اماں نے شروع میں ناک بھوں چڑھائی -

توبہ اللہ! یہ لڑکی ہر بات نئی کرتی ہے - اب غیر جوان بچیاں اپنے گھر میں رکھنا کہاں کی عقل مندی ہے -

مگر یہ سب کچھ تو رضیہ نے کہا تھا - وہ خود تو وہاں رہنے کو آئی - اور ہفتہ بھر بعد ہی اپنی چار ہم جماعت کی سفارش کرنے لگی -

وہ خالدہ بیچاری اپنے بھائی کے دوست کی بہن کے ہاں رہتی ہے اور زہرہ لطیف تو تنگ آئی پڑی ہے - سوچ رہی ہے - ٹریننگ چھوڑ کر چلی جائے - مگر پانچ بچوں کا ساتھ ہے - اصغری تو ہے ہی اکیلی جان - میری مان تو اوپر والی یہ منزل انہیں دے دو - تمہارا جی بھی لگا رہے گا اور ہوسٹل بھی بن جائے گا - تم اس طرح کرو - ساتھ ہی ساتھ ننھے بچوں کا سکول بھی کھول لو - ہم تمہاری مدد کریں گی -

مگر ہوسٹل کا انتظام کون کرے گا -

تم سارا دن کیا کرتی ہو - ہم تمہیں پیسے دیں گے - تم چاروں کے لیے علیحدہ کھانا بنا دیا کرنا - باقی آکر ہم پروگرام بناتے رہیں گے -

پہلے دن خالدہ آئی -

رنگین دری میں بندھا ہوا بستر جس پر آدھی رسی اور آدھا ازار بند بندھا تھا - ٹین کا رنگین پھولوں والا بکس یہ اس کی ساری

کائنات تھی۔ اس نے بکس کو کمرے کے کونے میں رکھا۔ باریک سوت کی بنی ہوئی رنگین پایوں والی چارپائی پر بستر کھول کر ڈالا۔ اور اس پر چھپا ہوا سرخ پیلے کالے سفید رنگوں کا پلنگ پوش بچھا دیا۔ جس میں کروشئے کی بنی ہوئی لیس لگی تھی۔ بکس میں سے ایک پنج سورہ اور قرآن مجید نکالا۔ رنگین شیشوں والی الماری کا پٹ کھولا۔ جس میں سے لکڑی کی مخصوص گیلی گیلی بو آ رہی تھی۔ دوپٹے کے پلو سے الماری صاف کی۔ سب سے اوپر والے خانے میں قرآن مجید اور پنج سورہ رکھے۔ اور پلٹ کر کمرے کا جائزہ لیا۔

کمرے کے فرش میں سیمنٹ کے رنگین نقش و نگار بنے تھے۔ کمرے کا چھت لکڑی کا تھا۔ جس میں کٹاؤ کا کام کیا گیا تھا۔ الماریوں میں رنگین شیشے جڑے تھے۔ چارپائیوں کے پائے رنگین تھے۔ بلکہ سوت بھی رنگین تھا۔ (یہ رنگ محل جانے کسی شہزادی کی پناہ گاہ تھا۔ اور اب وہ ہندوستان کے جانے کسی شہر میں اس وقت میری ہی طرح کہیں سر چھپانے کو بھٹکتی پھر رہی ہو۔)

خالدہ اداس ہو کر کھڑکیوں میں لگے شیشوں کے رنگ گننے لگی۔

شام کو زہرہ لطیف پہنچ گئی۔ جو تیز تیز لہجے میں باتیں کرتی بے حد دکھی ہونے کے باوجود مسکراتی رہتی۔ مسکراہٹ اس کی عادت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس نے اپنی چارپائی دوسری دیوار کے ساتھ لگائی۔ اس پر بستر ڈال کر اوپر دوسوتی کی سفید چادر بچھائی۔ جس پر بڑے بڑے پیلے پھول بنے تھے۔ جن کا حاشیہ سیاہ تھا۔

رضیہ آئی تو ہاتھ میں چکنے چکنے لفافے تھے۔

آج تمہارے ہوسٹل کا افتتاح ہے۔ نیاز بانٹنے کے لیے میں بازار ہی سے حلوہ پوری لیتی آئی ہوں۔

میں نے آلو گوشت کا سالن بنا لیا ہے۔ اور روٹیاں تنور سے لگوائی ہیں۔ روٹیاں تنور پر مائی کی بہو گھر میں ہی لگا دیتی ہے۔

اس رات اسے محسوس ہوا۔ جیسے ذہن اور کندھوں پر نئی ذمہ داری پڑنے سے اس کی زندگی کچھ سہل کچھ آسان اور ہلکی ہو گئی ہے۔ وہ اپاہج پن کا احساس کہ اس کی جوانی اور زندگی والدین کے لیے مسلسل سوچ اور بوجھ ہے۔ اب قدرے کم ہو گیا تھا۔

یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ اس رات اسے بہت کم نیند آئی۔ جانے نئی ذمہ داری کا خوش کن احساس تھا ——— یا زندگی کے اس اجنبی موڑ کا کرب۔

مہینہ کے اختتام پر اوپر والی منزل میں دس لڑکیاں آ چکی تھیں۔ مزید لڑکیاں آ سکتی تھیں۔ اگر ہوسٹل کا نام وغیرہ رکھا جاتا اور اسے باقاعدہ طور پر اقامت گاہ بنا دیا جاتا۔

چارپائی پر چھابے میں رکھی سالن کی پلیٹ میں لقمہ بھگوتے ہوئے اصغری نے کہا تھا۔ ہوسٹل کا نام پاکستان گرلز ہوسٹل کیسا رہے گا۔؟

ارے بھئی۔ پاکستان کی ہر چیز پاکستانی ہے۔ تو پھر مچھلی بیچنے والے کی طرح نام کا بورڈ لگانا کون ضروری ہے۔ اس کا نام صرف گرلز ہوسٹل کیوں نہ رہے ——— تابندہ نے اظہار خیال کیا۔ وہ اسلامیات میں ایم۔ اے کر رہی تھی۔

گرلز ہوسٹل بھی تو وہی مچھلی کی دکان کے بورڈ والی بات ہے
میری سنو بیبیو — اگر تم نے اسے پاکستانی ظاہر کرنا ہے تو پاکستان
کا لفظ پاک لے لو۔ اور اگر پاکستانی معیار ظاہر کرنا ہے۔ تو سٹینڈرڈ
کا لفظ جوڑ لو — اب بتاؤ —
پاک سٹینڈرڈ گرلز ہوسٹل کیسا رہے گا۔ نشاط نے بات ختم کر
کے سب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔
گھر کی پیشانی پر تو بورڈ آویزاں نہیں کیا گیا۔ مگر آنے والی لڑکیوں
کی سہولت کے لیے فارم اور سلیپ بک جو چھپوائیں گئیں۔ تو ان میں
پاک سٹینڈرڈ گرلز ہوسٹل ہی لکھا گیا۔ فارم پر ہوسٹل کے قواعد
وضوابط کا اندراج بھی ضروری تھا۔ جسے بنانے میں امی اور ابا
نے زیادہ حصہ لیا۔
(۱) کوئی لڑکی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر باہر نہیں جائے۔
(۲) کسی لڑکی کو کوئی مرد عزیز ملنے نہیں آئے گا سوائے اس کے
جس کا نام ہوسٹل کے رجسٹر میں داخلے کے وقت درج ہوگا۔
(۳) یہاں رہنے کے دوران ہمارے قواعد وضوابط کی پابندی
کرنا ہوگی۔
(۴) آدھے پیسے پیشگی ادا کرنا ہوں گے۔
(۵) زر ضمانت داخل کرنا ضروری ہے۔ جو ہوسٹل چھوڑتے
وقت ادا کر دیا جائے گا۔
ایک بی بی بیس روپے ماہانہ مشاہرہ پر رکھی گئی۔ کہ الگ سے کھانا
پکا لیا کرے — اس کی دو بیٹیاں بھی ساتھ آنے لگیں۔ تو لڑکیوں نے

ان سے اپنے کپڑے وغیرہ دھلوانے شروع کر دیئے۔ نچلی منزل کا بیرونی کمرہ "وزیٹنگ روم" بنا دیا گیا۔ اور کچے صحن میں پودینہ، دھنیہ سونف اور سبزیوں کے علاوہ پھولوں کی بیلوں کی قلمیں لگا دی گئیں

اوپر والی منزل کے برآمدے اور صحن میں لکڑی کے بکسوں اور پرانے کنستروں میں موتیے اور رنیا زبو کے پودے لگا دیئے گئے۔ نچلی منزل میں کھانا پکتا۔ تو ہر کمرے میں مائی برکت کی بیٹیاں مہتابی اور خورشیداں چھابے میں سالن کی پلیٹ اور روٹی رکھ کر دے آتی۔ اکثر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سالن چھابے میں چھلک جاتا۔ اور لانے والی کی قمیص داغ دار کر دیتا۔ . . . پھر ٹین کی ٹرے لائی گئی جس میں شالامار کی تصویر تھی . . . مگر تصویر کے رنگ جلد ہی پھیکے پڑ کر جگہ جگہ سے مٹ گئے . . . پھر اوپر والی منزل کے برآمدے میں چقیں ڈال کر اسے کھانے کے لیے کمرہ بنا لیا گیا۔ نئی آنے والی لڑکیوں نے اپنے اپنے کمروں میں کیلنڈر، تصویریں، پلاسٹک اور کاغذ کے پھول سجانے کے ساتھ ساتھ کھانے کے کمرے کی بھی سجاوٹ کر دی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جانے والی لڑکیاں اپنی اپنی نشانی چھوڑ گئیں جن میں سورۂ مزمل، سورہ یاسین کے رنگین فریم۔ آیۃ الکرسی کے چارٹ، مختلف کمپنیوں کے پرانے کیلنڈر۔ مگر جن کے سن اور دن پھاڑ کر اب صرف مختلف مناظر اور تصاویر رہنے دی گئی تھیں۔ کاغذ اور پلاسٹک کے پھول۔ موتیوں اور ریشمی دھاگوں کے ہار۔

یہ نشانیاں یادگاروں کا کام تو دیتی ہیں۔ مگر آنے والی لڑکیوں کے لیے نشانِ پا نہ ثابت ہوتیں۔ کہ معاشرہ

بے حد تیزی سے بدل رہا تھا۔ اور بدلتے حالات میں کوئی بھی نقش دیرپا نہیں ہوتا۔ اسے یادگار کے طاقچوں میں سوغات کے طور پر تو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان سانچوں میں اپنے سائے فٹ کرنا بھی محال ہو جاتا ہے۔

اور اس نے تو یوں بھی اپنے ہاتھ، حالات کی باگ سے اٹھا لیے تھے۔

اگر پرانی ہی ڈگر پر چلنا ہوتا۔ تو ممتاز اس وقت کسی بھلے سے گھر کی سلیقہ مند خاتونِ خانہ ہوتی۔ اور دو تین بچوں کی ماں بھی۔ جو لوری دینے سے قبل اپنے بچوں کو اپنے ماضی کے کارنامے سنایا کرتی۔ اور بچے تارا ایسی آنکھوں سے اسے تکتے۔ اور توتلی آوازیں پوچھتے۔

تو امی آپ نے اندریز حستومرت کو پتھر مارے تھے۔

(بچوں کے تصور میں انگریز حکومت ایک جلاد سا دیو ہوتا۔ جو آدم بو کا شور مچاتا ہوا فضاؤں سے زمین کی طرف لپک رہا ہوتا۔ مگر ان کی امی اسے پتھر مار مار کر مار ہی دیتیں)

اور اس کا سینہ فخر سے تن جاتا۔ اس کے سانس اُلجھ جاتے۔

اور ــــ

مگر یہاں تو نئی منزل تھی۔ اور اس منزل میں دور دور تک کہیں کسی کے نقشِ پا نہ تھے۔ جن کے لیے سجدے اس کی پھڑکتی رگوں میں مچلتے رہتے۔

یہی سجدے تو مختلف روپ دھار لیتے ہیں۔ جذبات و احساسات

کی چوٹ کھا کر ہر فرد، ہر عورت اپنا راستہ بناتی ہے۔ اور اپنی آسودگی تلاش کرتی ہے۔ یہ وجے لکشمی پنڈت اس مسلمان کے جوگ۔ میں اگر سیاست کا چولا نہ پہنتی تو کیا کرتی ــــ"

اور یہ فاطمہ بیگم مرحومہ (جنہیں مرحومہ کہنے کو جی نہیں چاہتا) کیسے مزے سے اس دن سنا رہی تھیں کہ اگر ان کی ازدواجی زندگی بڑی آسودہ بڑی بھرپور ہوتی تو وہ بھی بیگم شاہ نواز اور بیگم گیتی آرا بشیر کی طرح خدمت اور سیاست سے بہت جلد کنارہ کر لیتیں۔ مگر قدرت نے تو انہیں تیار ہی قومی خدمت کے لیے کیا تھا۔ اسی لیے تو اتنی چھوٹی عمر میں نکاح ہوا۔ اور رخصتی سے قبل ہی بیوہ ہوگئیں۔ تو باپ نے خواتین کے رسالے کی طرف متوجہ کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد پھر شادی ہوئی۔ تو خاوند انہیں آسودہ نہ کر سکا۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ چھوٹی اور دیہاتی بیوی نے میاں کی قبر پہ جوگ لے لیا۔ جیسا کہ اکثر مشرقی لڑکیاں عبادت میں سکون و آسودگی تلاش کرتی ہیں۔ مگر انہوں نے سیاست اور قومی خدمت کو اپنا لیا۔ اور کوئی نہ کوئی بے تاب سجدہ ان سے مسلمان عورت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرواتا رہا۔

اور ممتاز تمہیں بھی اپنی اسی راہ نما کے نقش قدم اپنانے ہیں۔ ہوسٹل تم نے کھول لیا۔ پرائمری سکول تمہارا بڑا کامیاب جا رہا ہے امسال وہ مڈل ہو جائے گا۔ اور پھر میٹرک اور پھر کالج ــــ ۔ ۔ ۔ ۔

مگر ــــ وہ ــــ وہ فاطمہ بیگم نے بھی تو نواں کوٹ میں لڑکیوں کے لیے کالج کی بنیاد رکھی تھی ــــ اور۔ وہ ــــ وہ ــــ

مگر ــــ بی۔ تم اتنی لمبی بات کیوں سوچتی ہو۔ بھلا کون جنیا ہے۔

تیرے زلف کے سر ہونے تک - مزہ تو جد و جہد اور امید و بیم کی کش مکش میں ہے - تمہارا ہوسٹل (مذکر --- واہ کیا مردانہ پن ہے) تمہارا محافظ بھی ہے اور جام جہاں نما بھی - کہ مختلف سکولوں، کالجوں دفتروں، محکموں، اداروں کی لڑکیاں ہوسٹل میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھیں - اس لیے ہر محکمے کی بات وہاں ہوتی - کھانے کی میز ہو یا کامن روم، یا دھوپ میں اوندھی سیدھی لیٹ کر چھٹی گذارتی لڑکیاں" - ان کی گفتگو کئی بار بحث کا رنگ اختیار کر لیتی - اور بحث بڑھ کر تلخ صورت اختیار کر لیتی -

جہیز کی لعنت لڑکے والوں نے قائم کی ہے -

لڑکی کا قصور ہے کہ کیوں جاتی ہے -

لڑکے والے انکار کر دیں لینے سے -

لڑکی نہ لے کر جائے -

تو کیا وہ گھروں میں بیٹھی بوڑھی ہو جائے -

اگر کسی کو اس کی ضرورت ہوگی - تو ضرور لے کر جائے گا -

ضرورت --- لڑکی کی ضرورت - ارے صاحب یہ دور تو وہ ہے جس نے انسان کی ضرورت ختم کر دی ہے - اسی لیے بقول شاعر :-

گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

اول ہوں میں نہیں مانتی - بلکہ حقیقت یہ ہے - کہ آج کے سائے ان انسانوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں - جنہوں نے معاشرے میں غلط رسموں، غلط رواجوں کو فروغ دیا - ان کی بنیادیں رکھیں - اور ہمارا

بیڑہ غرق کیا۔
بھئی تم تو نہ کہو۔ نائلہ تم تو اچھی بھلی آزاد خود مختار زندگی گذار رہی ہو۔۔۔۔

اس آزادی اور خود مختاری نے تو مجھے قید کر رکھا ہے۔ یہ ٹھیک کہ میں اس وقت گورنمنٹ کالج کی معزز لیکچرار ہوں۔ میرے ہاتھ میں پیسہ ہے۔ اور ذرا غور تو کرو۔ مجھے کتنی ذمہ داریوں نے گھیرا ہے۔ اور صاف صاف بتاؤں۔ میری مصروفیت، میرا مصرف یہ کچھ نہ تھا۔ جو میں نبھا رہی ہوں۔ میرے دور کی لڑکیوں کی یہ ذمہ داریاں دراصل اپنے والدین کی انتہائی بے بسی کا عکس ہیں۔ یہ اس دور کی علامت ہے جب گھرانے منتشر تھے۔ اور لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے کی بجائے اس میں کتاب اور مستقبل کی ڈور تھما دی گئی۔

اور اب یہ ڈور معاشی، معاشرتی، اقتصادی بھول بھلیوں میں الجھ کر جگہ جگہ سے گرہ دار بن گئی ہو۔ اب تو اس کا سرا بھی نہیں ملتا۔

مگر یہ سب کچھ تو ہمارے اس نعرے کا جواب ہے۔ جو ہماری اپنی پیش رو خواتین نے بلند کر رکھا تھا۔ کہ:۔

عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش حقوق دو"

تم لوگوں نے حقوق مانگے تھے۔ اب اپنے فرائض پر چنختی کیوں ہو؟۔

ہمارے برصغیر کی آب و ہوا سرد ممالک سے فرق ہے۔ ہمیں ان کی بہت سی دوائیں موافق نہیں آتیں۔ مغربی ممالک نے دوش بدوش کا نعرہ لگایا تھا۔ تو وہاں ان کے ازدواجی بندھن اس قدر

کٹھن اور مضبوط نہیں ہوتے۔ وہ جنسی آسودگی "سوسائٹی مینرز" کے نام سے حاصل کر لیتی ہیں۔ یہاں ہم نے ان کے دیکھا دیکھی دوش بدوش کا نعرہ لگایا۔ تو شادی کے پیغامات ہی سے گئے۔ کبھی بڑی عمر کا اعتراض آڑے آیا۔ کبھی سروس کا۔ کبھی بے پردگی کا۔ میں اپنی بیشتر خواتین میں ہوتی۔ تو کبھی یہ نعرہ نہ لگاتی۔

توبہ۔ ثریا۔ لگتا ہے تم آج پھر اپنے باس سے لڑ آئی ہو۔ کیوں اس نے پھر نئی ساڑھی خرید کر دینے کی فرمائش کر کے تمہارے فرائض میں جدید حقوق کو شامل کر دیا ہے۔

میرا باس تو ہے ہی بدنیت، ڈھیٹ، کمینہ۔ چار بچوں کا باپ ہے۔

مگر ثریا — اس کا قصور نہیں۔ گھر میں بیچارے کی بیوی ان پڑھ ہو گی۔ شمیم نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

اور ایک دم سے بہت سی آوازیں آنے لگیں۔

اس کا مطلب ہے۔ ہمارے باپ دادا بھی باہر ایسی حرکتیں کرتے پھرتے۔ توبہ۔ توبہ۔

خیر تم تو ہر بار اس کی ساڑھی نہ لے کر اس کا چٹان ایسا مضبوط دل پاش پاش کر آتی ہو۔ مگر ایسی بھی تو ہونگی۔ جو اس کے پاس محض ایک وقت کا کھانا کھانے یا کار میں لمبی سیر کے لیے آتی ہوں گی۔ بینا نے دل چسپی لی۔

یو آر رائٹ۔ انہی کمینوں سے تو میرا جی جلتا ہے۔ وہ آج بھی آئی ہوئی تھی — تبسم۔ ایک تو کم بخت کی آواز مردانہ۔ اس پہ

آتے ہی کہے گی
مرزا صاحب بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔
وہ اس فقرے سے مرزا صاحب کی جنسی اشتہا بھڑکاتی ہوگی۔ برآمدے کے سرے پر نماز والی چوکی پہ بیٹھے ہوئے تسبیح اس کے ہاتھ سے گر جاتی۔

ہا —— یہ لڑکیاں - اک طوفان ہیں۔ ہماری پہلی لڑکیاں کیسی ہوتی تھیں۔ شرمیلی' شرمیلی سی۔ نماز نہ پڑھنے کے دنوں میں بھی مزے سے سحری کھا کر چپ چاپ کام پر چل دیتیں۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ چھابے میں روٹی رکھ کر بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرنے والی لڑکیاں۔ وہاں اس الماری میں پہلے دن خالدہ نے پنج سورہ رکھا تھا۔ عابدہ اور ناہید بھی یہاں ہی رکھا کرتی تھیں۔ مگر یہ ثریا کم بخت اس میں انگلش ناول رکھتی ہے۔ ان کے ٹائٹل کیسے کیسے ہوتے ہیں ننگی عورتوں کے چکنے چکنے رنگین۔ اسے تو اردو پڑھنے کا بھی لطف نہیں آتا۔ پھُس پھُسے ناول۔ روتی ہوئی دکھ جھیلتی' آہیں بھرتی۔ جائے نماز پر بیٹھی بے وفا ہیرو کی صحت و زندگی کی دعائیں مانگتی ہوئی محبوبہ۔ اَخ تھو —— ارے بھئی۔ ناول کو حقیقت کا روپ ہونا چاہیئے —— اور حقیقت بغیر سیکس کے نہیں آسکتی . . . یہ ہماری فلمیں ہیں۔ جہاں سیکس کا منظر آئے گا۔ وہاں خواب کا ماحول لے آئیں گے —— مفرور انسان ——

اور وہ حقیقت پسند فیروزہ اور الماس۔ توبہ — توبہ۔ لڑکیاں چیخ اٹھتیں۔

کامن روم میں فیروزہ اور الماس کو خود لڑکیوں نے بہت بے آبرو کرکے نکالا تھا۔

"دو تین برس پہلے کی بات ہے۔ ہمارے اس ہوسٹل میں غالباً یہ تیسرے کمرے ہی فیروزہ و الماس رہا کرتی تھیں۔ اور یہ بات آج بھی میرے سمیت سب کے لیے سربستہ راز ہے۔ کہ ان میں مرد کون تھا۔ اور بیوی کون تھی ——"

کھانے کی میز پر کہنیاں ٹکائے ثریا نئی آنے والی لڑکیوں کو ہوسٹل کا انوکھا رومان سنا رہی تھی۔

"ہاں —— تو کیا نام ہے آپ کا ——"

منزہ ——

او —— آئی سی۔ ہاں تو منزہ ڈیر۔ فیروزہ کپڑے دھوتی۔ استری کرتی۔ الماس باہر سے پھل مٹھائی وغیرہ لاتی۔ مگر کھانا بھی وہی پکاتی یہاں ایک اسٹو رکھ کر وہ کبھی کبھی اتوار یا شام کو اپنی پسند کی ڈش پکایا کرتی۔ وہی بچھونا۔ بستر لگاتی۔

وہ تو جلس آلود دوپہروں اور راتوں کو بھی اندر سے کنڈی لگا کر سویا کرتی تھیں۔ انیس نے شیشے کے ہنڈل والے گلاس میں چاکلیٹ ہارلکس گھولتے ہوئے لقمہ دیا۔

سونے نہ سونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مزہ تو اس وقت آتا جب کوئی نئی لڑکی فیروزہ کے پاس بیٹھ کر نٹنگ کرتی۔ اس کے ریشمی دھاگوں کی رنگین کڑھت کو سراہتے ہوئے کہتی۔

"باجی آپ تو بہت خوب صورت کام کرتی رہتی ہیں
آپ کا اخلاق وغیرہ تو ویسے مجھے بہت اچھے لگے ہیں"
الماس اس وقت تو صبر کر لیتی۔ مگر لڑکی کے اٹھتے ہی فیروزہ کے بال نوچ کر پوچھتی۔
اچھا تو اب تو آوارہ ہوتی جارہی ہے ۔۔۔
پھر ان کی یہ لڑائی پہروں چلتی۔ ان کی صلح کی شرائط بھی بڑی دل چسپ تھیں۔
یعنی یہ کہ کامن روم میں سب لڑکیوں کی موجودگی میں فیروزہ الماس کو پندرہ مرتبہ (KISS) کرے گی۔ اور الماس اُسے ایک عدد سمارٹ سی قمیص سی کر دے گی۔
صلح ہوتی۔ تو کامن روم میں توبہ۔ توبہ۔ استغفر اللہ کی آوازوں میں زوردار تالیاں پیٹی جاتیں۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں باہیں ڈالے اپنے کمرے کو چل دیتیں۔
دوسرے دن فیروزہ سب لڑکیوں کو چائے کے ساتھ مرغ یا آلو کے قتلے تل کر کھلاتی۔ اور الماس بیٹھی قمیص سیتی رہتی۔ اور ہفتہ بھر بعد تک تو گویا وہ دونوں آپس میں کیل ٹھونک کر جوڑ دی جاتیں — ہوسٹل میں کبھی ایک لمحہ کو بھی الگ نہ بیٹھتیں۔
جلد شادیاں نہ ہونے سے کیسے کیسے مسئلے بن جاتے ہیں۔ عصمت سارا دوش غلط رواجوں کو دیتی۔ وہ ممتاز کے سکول یعنی پاک سٹینڈرڈ گرلز ہائی سکول کی استانی تھی۔ اور سکول کی ان دیگر استانیوں سے نالاں رہتی۔ جو مڈل اور میٹرک کی نوخیز طالبات کو (FAVER) اور پیار

کر کے اپنے دم توڑتے سجدوں کو بہلایا کرتیں۔

نہیں — نہیں — ثریا چیخ اٹھی۔ شادی کا پرابلم نہیں تھا۔ الماس نے تو دو بار اپنی منگنی تڑوائی تھی۔ اور جس دن انہیں یہاں سے نکالا گیا ہے۔ یہی معاملہ تھا۔ ماں تو بے اختیار روتی تھی۔ آخیر ہم نے فیروزہ کی دوستی قمر سے لگا دینے کا سوچا۔ کہ اس میں بھی ایسے جراثیم پائے جاتے تھے۔ الماس کو اس طرح اس سے متنفر کیا۔ جونہی الماس کا نکاح ہوا۔ فیروزہ اعصابی کھنچاؤ میں مبتلا ہو گئی۔ چیخ چیخ کر روتی اور الماس کب اپنے شوہر کے پاس ٹکی ہے۔ ابھی تک سروس کر رہی ہے۔ فیروزہ کے ایک عزیز کے مکان میں دو کمرے لے رکھے ہیں۔ وہاں ہی اکٹھا رہتی ہیں۔ مگر ابھی تک یہ راز نہیں کھلا۔ کہ ان میں خاوند کون ہے۔ اور بیوی کون۔

ارے یار — حکومت خواہ مخواہ ہی فیملی پلاننگ کے محکمہ پر اتنا خرچ کر رہی ہے۔ بھئی سکولوں میں یہ مرض عام کیوں نہیں کر دیتی۔

اچھا تو شکیلہ تم میری نوکری ختم کروانا چاہتی ہو۔ ریحانہ سنتے ہوئے بولی۔

تمہاری نوکری تو پکی ہوتی جا رہی ہے۔ کہ معاشرے کی بدلتی قدروں کا توازن برقرار رکھنے کے لیے تم لوگوں کی تمہارے محکمے کی اشد ضرورت ہے۔

ہمارے محکمے کی ضرورت تو بیچاریاں بیبیاں ازل سے محسوس کرتی چلی آ رہی ہیں۔ محکمے کی ایک تحقیق کے مطابق تو پرانے وقتوں میں

عورتیں بچوں کو دیوتاؤں کا عطیہ سمجھتی تھیں۔ تو زیادہ بچوں سے چھٹکارہ پانے کو وہ اپنے آپ کو گندگی میں لبالیتی تھیں۔

اپنے کانوں اپنے سروں اور اپنے سینوں پر مردہ جانوروں کی ہڈیاں پرو پرو کر باندھا کرتیں۔ کہ ایسی حالت میں دیوتا ان کے نزدیک نہ آئیں گے۔

اور نہ ہی اولاد کی آشیر باد دیں گے۔ سنا ہے بہت سے قبیلے تو اپنی بیویوں کو وہ پانی پلایا کرتے تھے۔ جو کسی مردے کو غسل دے کر حاصل کیا جاتا تھا۔

یعنی مردے کی دھون — بہت سی آوازوں نے پوچھا۔ ہاں۔ ہاں۔ بھئی — جدید تحقیق کے جائزے میں ایک دوا اور بھی ہے۔ جس میں مگرمچھ کا فضلہ استعمال ہوتا ہے۔ خواتین وہ بھی استعمال کر گذرتیں تھیں۔

اُخ تھو —

اُخ تھو۔

توبہ۔

استغفراللہ۔

لعنت۔

ریحانہ کی آواز دب جاتی۔ اور جب سب اپنے اپنے دوپٹوں رومالوں سے اپنے اپنے منہ پونچھ لیتیں۔ تو پھر ایک آواز ابھرتی۔ مگر یار — ہمارے ہاں تو جدھر دیکھو۔ کنواریوں کی کھیپ کی کھیپ ملتی ہے۔ پھر یہ کم بچوں کا نعرہ کیوں — ؟

ہمیں کیا پتہ ہمارے محکمے میں تو خود اکثر لڑکیاں کنواریاں ہیں۔
حالانکہ یہ وبا کبھی صرف محکمہ تعلیم میں ہوا کرتی تھی۔
ان کے لیے تو ایک لطیفہ مشہور ہے۔ کہ جو لڑکی محکمہ تعلیم میں گئی۔
والدین بے فکر ہو کر بیٹھ گئے۔ کہ چلو — اب اس کی شادی کی کیا
ضرورت ہے۔
دراصل یہ سب کیا دھرا مس خدیجہ فیروز دین کا ہے۔
ہاں۔ اس محکمے میں امام وہی ہے لڑکیوں کی۔
مگر دوسری ہی تقلید نہ کرتیں۔
بھئی ہماری لڑکیوں کے ساتھ ایک پرابلم ہے۔ وہ مردوں کے
مقابلے میں خم ٹھونک کر میدانِ عمل میں اتری تھیں تو یہ وعدہ کر کے۔
کہ اپنا پلو نہ ان کو پکڑائیں گی۔ ان کا خیال تھا۔ مرد وسے منتیں کر کے
انہیں بیاہ لے جائیں گے۔ مگر وہ ہوتا ہے ناں۔ کہ ہماری قدیم کہانیوں
میں ہمیشہ چھوٹی شہزادی دانا، ذہین اور نصیبے والی ہوتی ہے۔ تو
بڑی بہن کا نخرہ دیکھ کر چھوٹی نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔۔
دیکھ لو —
ہر گھر میں چھوٹی بہن بیاہی جا چکی ہے۔ اور راج کر رہی
ہے۔
یقیناً چھوٹی بہن۔ معاملہ فہم اور عقل مند ہوتی ہے ناں۔
ہاں — وہ بڑی کی سعادت مندی۔ اور ہٹ دھرمی کا
حشر دیکھ چکی ہوتی ہے۔

کیا شمشاد بھی میری طرح سدا اسی طرح زندگی گذارے گی۔ ہمارے وقتوں میں تو مصیبت یہ تھی۔ کہ لوگ کہیں بیٹھنے نہ پائے تھے۔ اس وقت رشتوں ناطوں کا ہوش کسے تھا —— ہاں جو افراتفری میں چند نکاح ہو گئے تو گھر بس گئے۔ ورنہ لڑکے جوان ہو گئے۔ اور لڑکیاں بوڑھی کہلائی جانے لگیں۔ اس لیے اس دور کی ساری ممتاز کنواری رہیں اور شمشاد بیاہ دی گئیں۔

شمشاد کو اس نے بی۔ اے کروایا تھا۔ ان دنوں بڑی پھوپھی کا رجحان امریکہ جا رہا تھا۔ چانس بڑا اچھا تھا۔ شمشاد اپنے گھر کی پہلی بی۔ اے پاس لڑکی تھی۔ جس نے برقع صرف ایف اے تک پہنا تھا۔ اپنے کالج کے مشاعرے میں ایک عدد غزل بھی پڑھی تھی۔ اور کامن روم میں بیٹھ کر لڑکیوں کے ساتھ انگلش، اردو اور پنجابی فلموں پہ بڑا شاندار تبصرہ بھی کیا تھا۔

پاکستانی جدید گھرانے ترقی کے دور میں داخل ہو گئے تھے۔ اس کے لیے لازم تھا۔ کہ لڑکیاں اپنی بیرونی ساکھ کے لیے باور کرائیں کہ:۔

ہمارے ہاں تو زمانہ قدیم سے ہی لڑکیوں کی آزادی کا رواج تھا۔ اور یہ کہ ہمارے والدین سخت قسم

کے ترقی پسند ہیں۔

اب اس نے کالج میں اس اعتراف سے انکار کر دیا تھا۔ کہ اس نے کبھی گھر کا کام کیا ہے ---- امی ہی سب کام کرتی ہیں۔ گویا ماں اس کے لیے وہ پرانی روایت ہے۔ جس نے عورت بن کر گھر میں ضروری اور بلند مقام حاصل کیا۔ مگر وہ خود اپنا مقام اس معاشرے میں تعین نہ کر پائی۔ کہ اس نسل نے تو گھرانے کا چہرہ مہرہ بننا تھا۔ اور چہرے پر ملکی اور غیر ملکی میک اپ کی تہیں چڑھنا ضروری ہیں۔

تب اس ضرورت کے لیے گھر کا ہر اچھا کپڑا اس بیٹی کے لیے چاہیئے جو باہر نکلتی ہے۔ اور سوسائٹی میں جا کر ان کی ساکھ رکھتی ہے۔

ابا کا قائم کردہ پھلور جنرل سٹور خاصا چل نکلا تھا۔ رحمان ابا کا دستِ راست بن چکا تھا۔ اور ابا کا کہنا تھا "یہ تو سب نام کی برکت ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کے قصبے پھلور میں جو ان کے گھرانے کی عزت تھی۔ مولا نے یہاں بھی وہی ساکھ رکھی ہے۔

کچے صحن میں گری پڑی دو کوٹھڑیوں کی ملکیت بدل کر اسے رہائشی کمروں کا روپ دے دیا تھا۔ جو اب رحمان اور اس کی بیوی بچوں کی ملکیت تھا۔ ساجد اور اکبر بی۔ اے سے بعد ملازمت کر رہے تھے۔ شمشاد، نادرہ، ساجد اور اکبر ہی اس گھر کے اہم رکن تھے۔ بلکہ شمشاد تو ریحان کے ساتھ بیاہ کر امریکہ جا چکی تھی۔ اب گھر کی ساکھ نادرہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور اماں کو اکبر کے لیے دلہن کی تلاش تھی۔

وہ کئی بار ہوسٹل کی لڑکیوں اور سکول کی استانیوں کو اس نظر سے دیکھ چکی تھی۔

پھر مائی رکھی کے ساتھ پہروں بیٹھی ان پر تبصرہ بھی کرتی تھی۔ مائی رکھی قصبے کی کمہاری تھی۔ اور پاکستان میں بھی ان کے نزدیک ہی آن آباد ہوئی تھی۔ آج کل لڑکیوں کے کپڑے دھونا بازار سے سودا سلف لانا اور روز ریٹنگ روم میں چوکیداری کے فرائض نبھاتی تھی۔ اسے اماں کی مرضی کے مطابق کوئی لڑکی من نہ بھائی تھی۔ بلکہ اسے تو ان سب لڑکیوں میں نسوانیت کی کمی نظر آتی تھی۔ وہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہوئی۔ کہ ایک روز جو نسیمہ ان کے پاس سے گذری۔ تو صحن میں بیٹھی بھنڈی بناتے دیکھ کر بڑے دھیمے پن سے کہا:۔

خالہ جی۔ بھنڈی کے پیٹ کو تراش دینے سے مصالحہ اندر تک رچ جاتا ہے۔ آپ درمیان میں تو چھری لگا ہی نہیں رہیں۔

یہ لڑکی جو بالکل تنگ پائنچوں کی شلوار اور اونچی قمیص پہنے ہوئے ہے جس کی ایک کلائی میں کالے فیتے کی سنہری گھڑی بندھی ہے۔ اور سر پر سہارا دے کر بنایا ہوا گول جوڑا — یہ۔ یہ لڑکی باورچی خانے کی بات کر رہی ہے۔ اپنے ہاں تو شمشاد اور نادرہ نے کالج جاتے ہی چائے تک بنانا گوارا نہیں کیا۔

اماں نے چھری کے میلے دستے سے گردن پر بکھرے مہندی رنگے بالوں تلے کھجلی کی۔ اور نسیمہ کی خانہ داری کو کسی رسالے میں پڑھی ہوئی ترکیب سے زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے بات کا رخ ایک دم گرم موسم کی طرف موڑ دیا۔

وائیل کا کرتا آپ مجھے دے دیں۔ کاڑھنے کو خالہ جان ......

نہیں — تمہیں کاڑھنا آتا ہے۔ اماں نے بھنڈی کی لیس ہتھیلی

سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ لہجہ صاف چغلی کھا رہا تھا۔ کہ وہ سب کچھ جھوٹ سمجھ رہی ہیں۔

تو کیا خالہ جان آپ مجھے لڑکی نہیں سمجھتے؟ نسیمہ نے اٹھلا کر پوچھا۔

مگر تم تو دفتر میں کام کرتی ہو —

مگر دفتر میں کام کرنے سے لڑکی کی فطرت تو نہیں بدل جاتی۔ بلکہ دفتر میں کام کرنے کے دوران ہم گھریلو کام نہ کریں۔ تو زندگی بڑی بور ہو جائے۔ اور آپ نہیں جانتی خالہ جان صبح جب آپ اپنے باورچی خانے میں پراٹھے پکاتی ہیں۔ اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو ہمارے کمرے میں جاتی ہے۔ تو میں آنکھیں بند کر کے ایک لمحہ کو تصور کرتی ہوں جیسے میں اپنے گھر کے باورچی خانے میں اماں کی پیڑھی کے قریب بیٹھی ہوں —

یقین کیجئے خالہ جان! باجی فرزانہ کا ہوسٹل ہمیں اسی لیے پسند ہے کہ یہاں رہ کر ہم اپنے گھروں سے دور نہیں ہو پاتیں۔ ورنہ شہر میں ایک سے ایک انوکھا ماڈرن ہوسٹل کھل گیا ہے۔ جہاں نہ یہاں ایسی پابندیاں ہیں۔ نہ سخت اصول ...

بھنڈی کی نوک کاٹتے ہوئے چھری انگلی میں جا لگی۔

دیہ لڑکی میری نظر سے پوشیدہ کیوں رہی اب تک —؟

چھمو جلدی سے آ — تجھے مزے کی بات سناؤں۔ وہ بونگا آج پھر گیٹ پر کھڑا تھا۔ اپنی سلیٹی ٹوٹا لیے ...

سچ —؟

نسیمہ پرس اور گاگلز اٹھا کر مسرت کی طرف لپکی۔

جھوٹی ابھی ماں کو یاد کر رہی تھی۔ اور بڑی گھریلو بن رہی تھی۔
گاڑی والے کا نام سنتے ہی کیسے بہکی چلی گئی ہے۔ کمینی۔۔۔۔

رکھی کمہاری نے اپنی ران کھجاتے ہوئے مسکرا کر کہا :۔
میں سمجھ رہی تھی۔ کہ بڑی بی بی جھانسے میں آگئی ہے۔ یہ سب لڑکیاں
ہاتھی کے دانت ہیں بی بی ــــ یہ چودھویں صدی ہے۔ اسی کے لیے
تو کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ کنواری بر مانگے گی۔۔۔۔ دیکھ لو ــــ خود
پیچھے پیچھے دوڑتی پھرتی ہیں۔۔۔۔۔ زمانہ کیا ہے۔ کل جگ ہے
کل جگ ــــ

اے ہے رکھی۔ مجھے اپنی بہن کی بیٹی عقیلہ۔ کیا بڑی ہے؟
اپنی بی بی سعیدہ کی منجھلی لڑکی ــــ اے میں کہوں بی بی۔ اس کی کیا بات
ہے۔ اپنا خون ــ اور آج کل تو سب سے بڑی بات خون کی ہے۔ وہ
اپنا ہوتا تھا تاں۔ جھولا میراثی پاکستان میں آکر اس نے اپنی دھی کو
دس جماعت پاس کروائے۔ ہسپتال میں نوکر کرادیا۔ بڑی گٹ مٹ کرنے
لگی۔ تو اس کا بیاہ یہاں کر دیا۔ بڑا افسر ہے۔ میں نے ایک دن لڑکے
کی ماں سے کہا۔ تم تو افسر ہو۔ اور یہ لڑکی ــــ اس کا باپ تو یہاں آکر
ٹھیکیدار بن گیا ہے۔ وہاں تو میراثی تھا ــــ تو وہ بی بی جھٹ بولی
ہم نے تو لڑکی دیکھی ہے۔ اور پھر ساری ذاتیں اللہ کی ہیں۔
سب اللہ کے بندے ہیں۔

جس نے کہا بڑی آئی تو رب کی سگی۔ لو بھلا ہمارے وقتوں میں بی بی
رب اور تھا اور ان کا اور ہے ــــ کوئی بات تھی تو کوئی کمہار بنا۔
کوئی میراثی۔ کوئی زمیندار اور کوئی مصلی ــــ۔۔۔۔۔ اب بی بی رب

تیرا بھلا کرے۔ ہمیں کیا پتہ۔ ان میں کون ڈوم تھا کون چمار۔ یہاں تو سب رانی خاں کے سالے بنتے ہیں۔ اس لیے بی بی میری مان تو بہن کی لڑکی لے آ ـــ بھلی رہے گی ۔۔۔۔

مگر پیاز کاٹتے ہوئے اماں کے ذہن میں نیا خیال ابھرا ـــ

اکبر تو تاجی سے چوتھے نمبر پر ہے۔ مجھے تاجی کا خیال کیوں نہیں آتا حد تو یہ ہے کہ اس کے باپ نے بھی کبھی بات نہیں کی۔ اپنے ملک میں تھے تو برادری میں جس کی لڑکی اٹھارہ برس سے اوپر ہوتی۔ یہ سب سے پہلے بات اٹھاتے ـــ کہ رشتہ جلدی کرو ـــ مگر اب تاجی دوگنی عمر کو الانگ گئی۔ اور ـــ اور ـــ ہا ـــ میری تاجی! تو سب سے اچھی ہے۔ اس نے باپ بن کر گھر کی اقتصادی مدد کی ہے۔ اس نے ماں بن کر چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے ایثار کیا ہے۔ کیا اس کی ساری زندگی یوں ہی تارکہ بیٹھی گذر جائے گی۔ اور یہ ہو سکتی ہے ـــ اماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہ نکلیں اور مائی بھاگن نے لپک کر پیاز تھام لیا۔

اے بی بی۔ کئی پیاز تو بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ بڑے کڑوے جانو۔ ان کے کھیت میں وارثوں کی مار کٹائی ہو کر خون گرتا رہا ہوگا۔ غصے والا ـــ ۔۔۔ لا ـــ مجھے دے۔ میں کاٹ دوں ـــ ۔۔۔

ممتاز کا خیال تھا۔ اکبر کے لیے نسیمہ بہترین ساتھی ثابت ہوگی۔ وہ سوشل ویلفیر کے محکمہ میں ملازم تھی۔ دونوں میاں بیوی کمائیں گے تو آئندہ گھر کا معیار بلند ہوگا۔ بچے خوش حالی کی فضائیں پرورش پائیں گے۔ نسیمہ ہے بھی بڑی گھریلو ـــ مگر اماں تو عقیلہ کو نظر میں

بسا چکی تھی - بات تھی بھی سچ - خالہ سعیدہ کی پانچ بیٹیاں ہیں - ایک ایک کا بر ڈھونڈتے خالہ کہاں کہاں ماری پھرے گی - اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں - اور وہی بات کہ نئے ملک میں کیسے پتہ - کس کی ہڈی کس کا خون ہیں - اور نخرے ہزار - ہر خاندان یہی کہتا ہے - میرے باپ دادا کی حویلیاں تھیں - وہاں اپنے گھر کی بہو لائیں گے تو کل کو تجھے ہی آرام ہو گا - پرائی ہو گی تو شاید تیرے ساتھ نباہ نہ کر پائے —— !! اماں نے معاشرتی قدروں کا آخری پتہ پھینکا - مگر مجھے کسی کی پرواہ ہی کب ہے —؟ میرا اپنا کام اپنا ٹھکانہ ہے - کام اور ٹھکانہ ہی تو سہارا نہیں ہوتے - رضیہ بھی تو کام ہی کرتی تھی —— شمیم نے بھی تو چھ سو روپے تنخواہ کے ہوتے شادی کی ہے - اچھے برے وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں - اس لیے میں تو اکبر کے لیے عقیلہ ہی کو لاؤں گی - میری اپنی ہو گی - پرائے دیس میں اپنوں سے کندھا ملا کر رہنے میں جو سکون ہے - وہ کہیں اور کہاں پرایا دیس —؟ ممتاز چیخ سی اٹھی -

تو کیوں چڑتی ہے - اے - تیرے لیے تو پرایا ہی نہیں - سوتیلا بھی ہے - جس نے ابھی تک تیری ہتھیلیوں کو بھی رنگین نہیں کیا -

مگر اماں! بات تو اکبر کی ہو رہی ہے - آپ مجھے کیوں گھسیٹ رہی ہیں ساتھ میں -

اور میرا جو کلیجہ چھلتا ہے - اس کا نام نہ لوں - تو کیوں سمجھتی ہے کہ مجھے تیرا دکھ ہی نہیں —— . . . اماں واقعی آنکھوں میں آنسو بھر لائیں -

چھوڑ ماں — خواہ مخواہ ہی دکھی ہو رہی ہے۔ ماں رہی۔ تجھے کیا پتہ۔ میں تو تیری سب سے سکھی اولاد ہوں۔

کیوں —

اماں کے چھائیوں بھرے گالوں پر گدلے گدلے آنسو پھسلتے ہی چلے جا رہے تھے۔

بھلا آنسوؤں پر بند کس نے باندھا ہے۔ اور پھر جب وہ ماں کے کلیجے کو چیر کر نکل رہے ہوں —

اپوا کے سالانہ اجلاس پر رضیہ آئی - تو ممتاز کو بھی ساتھ لیتی گئی - رضیہ اپنے علاقے کی جنرل سیکرٹری تھی - اور اُسے اپنی کارکردگی کی سالانہ رپورٹ پیش کرنا تھی -

ممتاز کا خیال تھا - اُسے پرانی بیگمات ملیں گی - تو ایک آدھ اس کی پرانی خدمات کا اعتراف کرے گی -

مگر نئی سٹیج پر کوئی پرانی کارکن نہ تھی -

دنیا بہت پھیل گئی ہے - سب لوگ کس قدر بدل چکے ہیں ۔ ۔ ۔
جانے کیوں کوئی چیز اندر ہی اندر ٹوٹ گئی - تو اس نے چونک کر اپنے آپ سے کہا :-

دیکھوں احساس کمتری میں ڈوبے جا رہی ہے تاجی - تم ایک عدد ہائی سکول اور ایک ہوسٹل کی مالک ہو - تمہیں پرانی خدمات کے اعتراف کی ضرورت ہی کیا - ہمیں اس وقت نئے اور پرانے کے چکر سے نکل آنا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لان میں رنگین نواڑی کرسیوں پر بیٹھی بیگمات اسے پلاسٹک کی گڑیاں نظر آ رہی تھیں - جو ایک ہی نظام کے تحت ایک ہی چابی سے ایک جیسی حرکتیں کر رہی تھیں -

رنگ و بو کے اس طوفان میں اپنے نام کا چرچا ہر زبان پر تھا - ہر

ایک کو یہ دعوے تھا۔ کہ اس نے خواتین کی فلاح وبہبود کے لیے بہت کام کیا ہے۔ حالانکہ یہاں فلاح کا دور دور نام نہ تھا۔ پلاسٹک کی گڑیاں اب بڑے جوش سے تالیاں پیٹ رہی تھیں۔ کہ انھوں نے عائلی قوانین پاس کروا لیے ہیں۔

اب کوئی مرد دوسری شادی نہ کرے گا۔

اس کے قریب بیٹھی خواتین میں سے ایک نے دوسری سے کہا مگر حیرت ہے۔ یہ تالیاں پیٹنے والی۔ یہ تقریریں کرنے والی۔ ان میں زیادہ تعداد دوسری بیویوں کی ہے۔

اسی لیے تو خوش ہیں۔ کہ اب تیسری کے آنے کا راستہ بند کروا لیا ہے۔

مگر —— یہ بیویاں کب ہیں —— بیویاں بیچاری تو کسی دیہات میں کسی پرانے شہر میں کسی مزارعے سے فصلوں کا حساب کتاب کر رہی ہوگی۔ یہ تو سب بیگمات ہیں۔

تیسری نے لقمہ دیا۔

اچھا تو تمہاری بیٹی کا رشتہ ہو گیا —— ؟۔ ساتھ والی عورت نے دوسری سے پوچھا۔

نہیں وہ تو باہر جا رہی ہے۔

تمہارا تو بیٹا بھی گذشتہ برس باہر گیا تھا ——

ہاں۔ بے بی بھی بھائی کے پاس امریکہ جا رہی ہے۔ کہتی تھی باہر نکل کر انسان میں بڑی وسعت آجاتی ہے۔

ممتاز نے گھوم کر بے بی کی اماں کی طرف دیکھا۔

شکل جانی پہچانی سی لگی ۔ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے ۔ یہ پہلے سے ذرا موڈرن ہوگئی ہے ۔ اگر اس کے پاؤں میں براؤن رنگ کے بغیر پالش کے سلیپر پہنا دیئے جائیں ۔ پھول دار شلوار سفید وائیل کی قمیص ململ کا دوپٹہ ۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں ــــ تو تو ــــ تو ــــ

یہ یقیناً زبیدہ کی ماں بن جائے گی ۔ ۔ ۔ وہی لبنی والی ماسی ۔ جسے لڑکیوں کی تعلیم سے اللہ واسطے کا بیر تھا ۔ ہمیشہ اپنا سفید لٹھے کا پرانا برقعہ لپیٹے، سلیپر پھٹ پھٹلتی، اماں کو نصیحت کرنے آتی ۔ کہ ممتاز کو سکول پڑھانے کا فائدہ ۔ اتنی دور جالندھر میں بھیج رکھا ہے کبھی کوئی اپنی بیٹی کو بھی شادی سے قبل یوں علیحدہ کرتا ہے ۔ اپنے آپ سے ۔ اور آج وہ اپنی "بے بی" (یقیناً زبیدہ سے چھوٹی والی ہوگی مگر بے بی تو وہ بھی نہیں) کو امریکہ بھیج کر کیسی مطمئن ہے ۔ اس کا جی چاہا وہ اس سے اپنا تعارف کروائے ۔ ابھی وہ کرسی سے اٹھی ہی تھی ۔ کہ ساتھ والی نے روک دیا ۔

ذرا سیدھی بیٹھیے ۔ دیکھیے تصویریں لی جارہی ہیں ۔

تمہاری تصویر تو پرسوں بھی اخبار میں تھی ــــ

ہاں ۔ وہ انٹرنیشنل ویمنز کلب کا اجلاس تھا ناں ۔ اسی کی ہوگی ۔

کیا آپ کو گائیڈ ہاؤس سے کارڈ آیا ۔

وہاں سے آیا ہے ۔ اور ان کا بھی آیا پڑا ہے ۔ بیگم فرخ حسین کی ویمنز سوشل ویلفر آرگنائزیشن کا ــــ وقت تو ملتا ہی نہیں ۔ پھر سوچتی ہوں چلو اسی بہانے کوئی نیکی ہو جائے ۔

ہاں ــــ میں بھی سوچتی ہوں ۔ سوشل ورک ہی سہی ۔

نیکی ـــ سوشل ورک ـــ ممتاز نے انہیں ملنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ تو بھلا ـــ تم لوگوں کی یہاں موجودگی ہی کسی نیکی کا عملی ثبوت ہے۔ کہ ـــ حالانکہ تمہارا لباس باعث تقلید ہے۔ نہ کوئی اور حرکت تمہاری باتوں میں کتنا تصنع ہے۔ کیا یہ سب ہمارے معاشرے کی راہ نما ہیں۔

اے ماسی تم تو جب اچھی تھیں۔ جب تم برقع پہنے ہمیں نصیحت کرنے آتی تھیں۔ جب تم میں اپنی ایک روایت زندہ تھی۔ مگر اب تم بدل چکی ہو۔ کیا معلوم تم اب مجھے پہچاننے سے انکار کر دو۔

رضیہ کے ساتھ چائے کی ٹیبل پر جاتے ہوئے اس نے ماسی بتی والی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اسے پہچانتی ہو۔

ہاں ـــ وہ مسز افضل ہیں۔ ہماری ہی طرف کی ہیں۔ مگر جہاں انہیں احساس ہو جائے۔ کہ کوئی پرانی جان پہچان کی ہے۔ اُسے نہیں ملتی۔

اچھا تو پھر میں ملنے جا رہی ہوں ـــ تاجی نے آگے بڑھ کر اُن محترمہ کے شیفون کے دوپٹے کا پلو پکڑتے ہوئے کہا۔

سنیے ـ آپ نے مجھے پہچانا نہیں ماسی۔ میں آپ کی زبیدہ کی سہیلی ہوں۔

تو ـــ تم ـــ ممتاز ہو ـ ماشاءاللہ اب تو تم نے بڑی ترقی کر لی ہو گی۔ کہاں سروس کر رہی ہو ان دنوں ـــ زبیدہ تو سعودی عرب میں ہے۔ اس کا میاں بنک میں ہے۔ بڑی خوشی ہے۔ مجھے بلا

رہی ہے۔ کہ آن کر جج کر جاؤ۔ نرگس نے ایم۔ اے کر لیا ہے۔ اب خیر سے امریکہ گئی ہے۔ اچھا میں ذرا بھاگ کر مسز بشیر سے تو مل لوں۔ وہ میرے سنٹر کی گرانٹ . . .

بستی والی ماسی سفید بکینشن میں بڑی سمارٹ چال سے آگے بڑھ گئی۔ تو ناجی نے سوچا

دنیا بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے زمانے کا لطیفہ مشہور تھا کہ :۔

ایک خاتون اپنے سسر کے ہمراہ سفر کر رہی تھی۔ اس کی ہم سفر نے بڑے میاں کو جو ساتھ دیکھا تو بولیں :۔

اے۔ ہے۔ تمہارا میاں دوہا جو ہے یا تر ہا جو۔ تم تو جوان ہو اور یہ اتنا بوڑھا —— اگلے وقتوں میں لڑکی اور عورت کا صرف ایک مقام تھا۔ "شادی"۔ اور اب عورت کا مقام بدل گیا ہے۔ آج کی عورت دوسری سے شادی کے متعلق نہیں —— سروس کے متعلق پوچھتی ہے۔

اسے چپ چاپ اپنے ہی خیال میں کھوئے کھوئے پا کر چائے کے ٹیبل پہ رضیہ نے سموسوں کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ تم یہاں اپنے آپ میں کھونے آئی ہو —— یا دنیا دیکھنے۔ ایک بستی والی ماسی کے لیے کیوں حیران ہوتی ہو . . . یہاں سب کی حیثیت بدل چکی ہے . . . زینب دائی تو تمہیں یاد ہوگی —— جس کی ایک خوب صورت سی بیٹی تھی۔ وہ بیٹی اس وقت خواتین کے پورے شعبے کی انچارج ہے . . . ماں زندہ ہے۔ مگر اس سے کسی کو ملنے نہیں دیتی۔ اور وہ ہماری کلاس میں ایک لڑکی ہوتی تھی۔ تمہیں

یاد ہوگی ۔ بشرہ، وہ تو پنجابی چھوڑ اردو میں بھی بات نہیں کرتی ۔ اپنے شوہر کے ساتھ زیادہ تر باہر رہی ہے ۔ اس کا لباس بھی بہت فرق ہوتا ہے ... ۔ شاید اس بار آئی نہیں اب کراچی جا چکی ہے ...

ہاں ۔ لو ۔ کباب کھاؤ ۔

چھیمی کا ڈانس غضب کا تھا ۔ اس نے کب سیکھا

ایک بھاری بھر کم بیگم نے چائے کا گھونٹ لے کر ایک دبلی پتلی سانولی کٹے ہوئے بالوں والی خاتون سے پوچھا ۔ جس کی قمیص کی بانہیں بھی غائب تھیں ۔ اور ہونٹوں پہ گہرے نارنجی رنگ کی چار چار سوت لپ اسٹک جمی تھی ۔

بس آپا ۔ کالج ہی میں سیکھتی رہی ہے ۔ اس کے ڈیڈی تو بہت ہی خوش ہیں ۔ ہم کوشش کر رہے ہیں ۔ کہ اسے باہر جانے کا چانس مل جائے ۔

ہاں ۔ جانا ہی چاہیئے ۔ بھلا یہاں کیا پڑا ہے ۔

اس ملک سے دولت، شہرت اور باہر کے سارے چانس سمیٹ سمیٹ کر تم لوگوں نے اب یہاں رہتے ہی کیا دیا ہے ۔ اب یہاں تمہارے سمیٹنے کو رہ ہی کیا گیا ہے ۔ جاؤ ۔ یہاں سے چلے ہی جاؤ ۔ خس کم جہاں پاک ۔ میز کی دوسری جانب کھڑی اک لڑکی نے بڑے حوصلے سے بات ختم کی ... ۔ اس کی ساتھی لڑکیوں نے قہقہہ لگایا ۔

ممتاز کو یوں معلوم ہوا ۔ جیسے اسے سہارا مل گیا ہو ۔ وہ کھسک کر ان کے نزدیک چلی گئی ۔

دوسرے کونے میں ایک خاتون اپنے دل چسپ سفر کا حال سنا رہی

تھی۔ جو حال ہی میں انہوں نے اپنے میاں کے ساتھ سرکاری دورے کے سلسلہ میں کیا تھا۔ اور اب انہیں پاکستان ایک دم بور لگنے لگا تھا وہ باہر کی عورت کو مثال بنا چکی تھیں۔ اسی لیے کہہ رہی تھیں۔

"ہمارے مرد بیچے ہیں۔ جو باہر جا کر پاگل ہو جاتے ہیں
اللہ، عورت ہے تو وہ"۔

مرد تو یونیورسٹی بس سٹاپ پر یا کسی تہوار پر روشنیاں دیکھنے آنے والی خواتین کو دیکھ کر بھی پاگل ہو جاتے ہیں۔" ان لڑکیوں کے گروپ نے پھر فقرہ بلند کیا۔

تم کسی اخبار کو انٹرویو کیوں نہیں دے دیتیں۔ ان کی دوست نے مشورہ دیا ۔۔۔ یہ سب یہاں کھڑی ہیں۔ جرنلسٹ انہیں ابھی دعوت دے دو ۔۔۔

"ہوں ۔۔۔ تو ۔۔۔ یہ صحافی ہیں۔ ممتاز نے انہیں سلام کیا۔ اور پوچھا ۔۔۔ آپ ان بیگمات سے بور نہیں ہو جاتیں ۔۔۔؟"

بیگمات کے بہروپ تو ہمیں ہنسنے کا موقع دیتے ہیں ۔۔۔ لو بھلا میں انٹرویو دوں تو پڑھنے والے کہیں گے۔ کہ شیخی مار رہی ہے ۔۔۔۔ وہ بیگم کسر نفسی کے کام لینے لگیں۔ اے تم چھوڑو۔ میں سنبھال لیتی ہوں۔ سب ۔۔ میں تمہیں پارٹی دیتی ہوں۔ بتاؤ تمہیں یہ سنڈے سوٹ کرے گا۔ یا سٹیرڈے بہتر رہے گا ۔۔۔ میں ان اخبار والیوں سے بات کر لوں ۔۔۔

مگر نوائے وقت کو نہ بلانا۔ ایک تو ان کی عادت میں میخ نکالنے کی ہے۔ کہیں سرکاری دورے ہی کو سکینڈل بنالیں۔ دوسرا۔ کم بخت

وہ عورتوں کی تصویریں تو چھاپتے ہی نہیں - نری خبر دینے سے کیا فائدہ -

عورت کی تصویر بھلا کیوں نہیں چھاپتے —

ہوگا کوئی کامپلیکس . . . .

زوردار قہقہہ پڑا —

اگر ان کا حساب بے باق ہے - تو پھر یہ مخالف اور حقیقت پسند اخباروں سے کیوں ڈرتی ہیں -؟

ہاں ہم اخبار میں تصویر دے سکتے ہیں - اگر وہ مل جائے -

جب امریکن ایڈ میں آئے ہوئے شنیل کے فراک بیگمات اپنی نوکرانیوں کے نام لے کر گھر لے جائیں - لحاف - کشن اور کپڑے بنانے کو — یا . . . جب خشک دودھ - غریب بچوں کو دینے کی بجائے قلفی بنانے والوں کو بیچ دیا جائے . . . .

صنعتی مرکز سے ہٹ کر کچے صحن میں چند غریب عورتیں سر جھکائے بیٹھی پاکستان کو دعائیں دے رہی تھیں -

(اسلام کی طرح پاکستان کا نام بھی غریب غربا لیتے ہیں - یہ کتنا بڑا المیہ ہے)

ممتاز دھیرے دھیرے چلتی سوچ رہی تھی - کہ اپوا کی کرتا دھرتا کو یہ کیوں دعوٰے ہے - کہ عورتوں میں بیداری انہوں نے پیدا کی - کیا یہ پاکستان کی تاریخ سے ناواقف ہیں -

ہم تو — آپا جی حمیدہ، فاطمہ بیگم اور مس فاطمہ جناح کے پیچھے پیچھے چلے تھے - ہمیں تو ان کی پرعزم مسکراہٹ یاد ہے -

ان دنوں تو یہ خواتین ان کے غرارے کو سو سو باتیں کیا کرتی تھیں۔ ماسی بستی والی کی طرح۔

لان میں کھڑی جرنلسٹ لڑکیوں سے چند اپوا کی ممبران کی بحث ہو رہی تھی۔ کہ مادر ملت نے اپوا کیوں چھوڑی۔ حالانکہ وہ اس کی پیٹرن تھیں۔

وہ بہت زیادہ ذمہ داریاں نہیں نبھا سکتی ناں۔ اب تو صرف گرل گائیڈ ایسوسی ایشن ہی سے واسطہ ہے انہیں۔ مگر پاکستان کی نمائندہ جماعت اور پاکستان کی مادر ملت کنارہ کر جائیں۔ آخر کچھ سبب تو ہو گا۔

اپوا کے فیشن سے ناراض ہوں گی ––

نہیں وہ اپوا کی تخریبی کاروائی سے نالاں تھیں۔

کیوں ––

وہ اس لیے کہ بیگم لیاقت علی نے جب قائد اعظم اور قائد ملت کی قبروں کی درمیانی دیوار توڑ ڈالی –– اپنی ممبران کے ساتھ مل کر ––۔۔۔ تو۔

کیا ––

ہاں – ہاں –– مادر ملت ہی نہیں۔ اس وقت تو اور بھی بہت سی بیگمات نے اپوا سے کنارہ کر لیا تھا۔ یہ اپنی بیگم آباد احمد۔ بیگم گیتی آرا البشیر۔ وغیرہ۔۔۔

مگر وہ دیوار ٹوٹنے کا قصہ کیا ہے بھئی۔

بات یوں ہے۔ کہ مادر ملت اپوا کی پہلی پیٹرن تھیں۔ اُن کے

بغیر پاکستان میں کسی سماجی تنظیم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بے حد اعلیٰ ذوق کی نفاست پسند با اصول خاتون تھیں۔ جب قائد ملت خان لیاقت علی فوت ہوئے۔ تو ان کا جنازہ توپ پر رکھ کر لایا گیا۔ نئی قبر اور قائداعظم کی مزار کے جنگلے کے درمیان جگہ تنگ تھی۔ اس لیے توپ کے لیے جنگلہ توڑ دیا گیا۔

مادر ملت چند روز بعد وہاں گئیں۔ تو جنگلہ شکستہ پایا۔ اس لیے گورنر جنرل سے کہا کہ اُسے ٹھیک کروا دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے جنگلے کی بجائے دیوار بنوا دی۔ دیوار ابھی گیلی ہی تھی۔ کہ سنتے ہیں پانچ موٹروں میں چند خواتین برقع پوش و بے نقاب وہاں پہنچیں۔ انہوں نے فاتحہ پڑھی — پھر برقعوں میں سے اوزار نکالے — اور دیوار توڑنے لگیں —

ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے روکا۔ تو انہوں نے جواب دیا۔

ہم قائداعظم اور قائد ملت کے درمیان دیوار حائل نہیں دیکھنا چاہتیں —

چنانچہ دیوار ٹوٹ گئی —

اس پر مادر ملت نے بڑے دکھ سے کہا:۔

افسوس! میرے بھائی نے اس ملک کے لیے جان دے دی — اور آج اس کی قبر کو بھی پناہ میسر نہیں —

چناں چہ انہوں نے اپوا سے اسی وقت استعفیٰ دے دیا۔ اُن کے مستعفی ہونے کی خبر جہاں جہاں گئی۔ اکثر مخلص خواتین نے اس تنظیم

سے استعفٰی دے دیا۔

کہتے ہیں۔ مسز روز ویلٹ جب پاکستان آئیں۔ اور انہوں نے محترمہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ تو اس اصول کی بندی نے جواب دیا:۔

"اس وقت آپ اپوا کی مہمان ہیں۔ میں نہیں مل سکتی۔ جب آپ پاکستان پھر کبھی آئیں گی۔ تو بخوشی ملوں گی ـــ

تو اس کا مطلب ہے۔ اپوا نے یہ کارنامہ بھی سرانجام دیا ہے ـــ ...

ہاں۔ ہاں۔ تو بھلا۔ یہاں کسی کی گفتگو سنی ہو۔ جو پاکستان سے پیار کرتی ہو ـــ"

ممتاز سوچ رہی تھی۔ کہ بیگمات تو کہہ کہہ کر انٹرویو دیتی ہیں۔ اخباروں میں۔ اک میں ہوں کہ مجھ پر وحشت سوار ہے۔ پھر امی مجھے اجازت ہی کب دیں گی۔ کہ اخبار میں میرا اور میرے ہوسٹل اور سکول کا فیچر شائع ہو۔۔ مگر گلشن، نسیمہ، شمیم بضد تھیں۔ کہ رپورٹر اُن کی دوست ہے۔ اور وہ اسے ضرور لائیں گی۔

(اپوا کے جلسہ پر وہ خود بھی ان سے مل چکی تھی۔
بلکہ اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ وہ کسی پر اپنے دکھ کا
اظہار کرے ۔۔ اور بتائے۔ کہ یہ آج کی پاکستانی
عورت کیا کر رہی ہے۔ کدھر جا رہی ہے)

نادرہ نے سب کمروں کی صفائی اور آرائش اپنے ذمہ لے لی تھی۔ سیڑھیوں تک میں ۔۔ میمن فرشتے کی طرح نقش بنا بنا کر چونا ڈالا گیا تھا کمروں پر خوب صورتی سے نام لکھے گئے تھے۔ کمرۂ طعام کے دروازے پر تو پھلوں، سبزیوں اور سجے ہوئے دستر خوان کی رنگین تصویریں چسپاں کی گئی تھیں۔ سب لڑکیوں نے اپنے اپنے کمرے کی آرائش میں پورا پورا حصہ لیا تھا۔

عظمہ خاص طور سے بازار سے کینڈل وک کا بیڈ کور لے کر آئی تھی۔ فیروزی رنگ کا بیس پر سفید ابھرے ابھرے پھولوں کا جال

بنا تھا۔۔۔ پھول دان میں سفید پلاسٹک کے پھولوں کا بڑا سا گچھا لگایا تھا۔ عصمت نے بہت خوب صورت کروشیا کا بیڈ کور اور میز پوش ڈالا تھا۔ شمیم اور گلشن نے اپنے بیڈ جوڑ کر ان پر کٹ ورک کا ڈبل بیڈ کور بچھایا تھا۔

طاہرہ کہیں سے منی پلانٹ کی بیلیں لے آئی تھی۔ اور ان بوتلوں میں لگا کر مختلف جگہوں پہ آویزاں کر رہی تھی۔۔۔

جوزفین نے کمرے کی دیوار پر پینٹنگ بنائی تھی۔

کامن روم میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے صحافی خاتون پوچھ رہی تھیں۔

آپ نے ہوسٹل اپنی کس ضرورت کے تحت شروع کیا تھا۔"

ہوسٹل کی ضرورت مجھے نہیں میری عزیز سہیلیوں کو محسوس ہوتی تھی۔ سب سے پہلے آنے والی بلکہ اس ہوسٹل کا سنگِ بنیاد رکھنے والی میری سہیلی رضیہ تھی۔ ہم جالندھر کے ہوسٹل میں اکٹھا رہتے تھے۔۔۔ وہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ اسے رہنے کا پرابلم تھا۔ میرے پاس آ گئی۔ باقی تین چار وہ اپنی کلاس فیلو لے آئی۔ ورنہ اس دور میں کسی کی جوان بیٹی اپنے گھر رکھ لینا کہاں کی دانش مندی ہے میں نے انہیں بہنوں کی طرح رکھا۔ میں اُن کا کھانا خود پکاتی تھی۔ بلکہ کپڑے بھی دھویا کرتی تھی۔۔۔ ہم بہت سادگی سے رہتے تھے۔۔۔ آپ کو جو یہاں آج اکثر لڑکیوں کے کمروں میں بجلی کی استریاں نظر آ رہی ہیں۔ یہاں کب تھیں۔ میری

بہن شمشاد صبح چولھے کے کوئلے استری میں ڈالتی تھی۔ تو سب اپنے کپڑے کر لیا کرتی تھیں۔۔۔ لٹھے اور پاپلین کی شلوار خوب بھگو بھگو کر استری کرتے تھے۔۔۔۔ ململ کے دوپٹے ہم اکثر اکٹھے بیٹھ کر چنا کرتے تھے ۔ میری اُن سہیلیوں نے مجھے حوصلہ دیا۔ ہوسٹل چلانے کا سلیقہ سکھایا۔ ان کی واپسی تک میرا گھر واقعی لڑکیوں کا ہوسٹل بن چکا تھا۔

آپ ہوسٹل کے علاوہ بھی کسی ادارے سے منسلک ہیں؟

جی ہاں ۔ پاک سٹینڈرڈ گرلز ہائی سکول بھی اپنا ہے۔ مگر ہوسٹل کی ذمہ داریاں کچھ ایسی ہیں۔ کہ سکول میں نے کلی طور پر اپنی ہیڈ مسٹرس مس نعیمہ غنی کے سپرد کر دیا ہے۔ اس لیے سکول کا کچھ حصہ نچلی منزل میں ہے۔ مڈل تک کا حصہ سامنے والی بلڈنگ میں ہے۔

آپ کا اپنا گھر کہاں ہے۔ اور آپ کا وطن کہاں تھا۔؟

میرا وطن اور میرا گھر یہی ہے۔ میرا ہوسٹل اور میرا اسکول۔ میری امی ابا پہلے نچلی منزل میں تھے۔ اب وہ سامنے والے فلیٹ میں چلے گئے ہیں۔ یہ پہلے ہمارا صحن ہوتا تھا۔ پھر اپنے ایک بھائی بھابی کے لیے دو تین کمرے بنوائے۔ اب دو منزلہ فلیٹ بنوا لیے ہیں مگر میں یہاں ہی رہتی ہوں۔

آپ لڑکیوں کی ذمہ داریاں پوری دیانت داری سے نباہتی ہیں۔؟

صحافی خاتون صوفے کی پشت پر پڑے جھالر دار صوفہ بیک کو دیکھتے ہوئے سوال ان سے کر رہی تھیں۔

ممتاز نے نروس ہو کر ہتھیلیوں کو آپس میں ملا اور کھنکھار کر بولیں :-

پہلے تو میں وثوق سے کہہ سکتی تھی۔ کہ پوری دیانت داری سے کرتی ہوں۔ مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ آپ سے صاف صاف کہہ دوں۔

بہت سی قباحتیں جن کے لیے رات کا اندھیرا ضروری ہے۔ اب معاشرتی حدود کو پھلانگ گئی ہیں۔ اب دن رات کی کوئی پابندی نہیں۔ اسی لیے مجھے احساس ہے کہ میری وہ ذمہ داری پوری نہیں ہوتی۔ جو ہونا چاہیے تھی۔

آپ کو لڑکیوں کے پرابلم بھی حل کرنے پڑتے ہیں۔؟

حل کرنے کے لیے تو اکثر یہاں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ دیکھئے ناں، میرے پاس ان دنوں ایک بچی ہے۔ اُن کے والد ہمارے نامور شاعر ہیں۔ ان دنوں غیر ملکی بیوی کے ساتھ بیرون ملک رہتے ہیں۔ یہ بچی کسی عزیز کے ہاں تھی۔ پھر کسی ہوسٹل میں گئی۔ وہاں سے یہاں آئی ہے۔ اسے اکثر اعصابی دورے پڑتے ہیں۔ تو وہ ہر ایک سے لڑتی ہے۔ ہر وقت جھنجھلائی رہتی ہے۔ کئی بار تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ سب کے سامنے اپنے کپڑے اتار دیتی ہے۔ جب دوسری لڑکیاں اسے سمجھائیں۔ تو وہ اُلٹا انہیں سمجھانے بیٹھ جاتی ہے۔ کہ فارن جا کر دیکھو۔ وہاں ایسا

ہی ہوتا ہے۔ تم پورے پاکستانی۔ تمہیں کیا پتہ لائف کیا ہے۔ باڈی کیسی ہونی چاہیئے۔ اور sex کا لائف سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ تبھی تو میرا باپ باہر جاکر ہینگ گرل سے میرج کرتا ہے۔ اور وہیں بھول جاتا ہے۔

مگر یہ لڑکی کیا کرتی ہے؟

لنڈے بازار سے خریدے ہوئے فراکوں کو ادھیڑ کر اپنے کپڑے سیتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی کسی عزیز کے ہاں جاتی ہے۔ یا گھر کے پرانے ملازم کے ساتھ کہ وہ کبھی کبھار آتا ہے۔ اسے بازار لے جاتا ہے۔ اس کی مرحومہ ماں کے وقت کا ہے۔ اس کے ساتھ پہروں بیٹھی باتیں کرتی رہتی ہے۔ پھر کہتی ہے:۔

دیکھو — تم ایم۔ اے کر کے بڑے افسر ہوتے۔ تو میں تم سے شادی کر لیتی۔ ویسے اس کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ غیر ملکیوں سے دوستی لگائے۔ کل اسے لڑکا تھا باہر جانے سے تو آج اپنے کمرے میں ننگی گھوم رہی ہے۔

آپ اسے مینٹل ہاسپٹل کیوں نہیں بھجوا دیتیں

ان کے عزیز کو فون کیا ہے۔ شاید کوئی لینے آجائے۔ ویسے وہاں جاکر یہ لڑکی اور پاگل ہو جائے گی۔ حالانکہ اس وقت اسے نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ اب اگر باپ نے باہر جاکر شادی کر لی۔ تو اس اولاد کا خیال رکھتا۔ اب یہ تمام دن اپنے آپ کو غیر ملکی بنانے میں صرف کر دیتی ہے۔ ہمارے ہاں خاص گھرانوں کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ ایک ہی کمرے اور دالان میں رہنے والے کنبوں کے

بچے بہت جلد شعور کی منزل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور سکیں کے معاملے میں بہت ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ اعلیٰ طبقے کی لڑکی غیر ملکی جوان ماں اور باپ کی ازدواجیات کے بارے میں بڑی کھلی بحث کرتی ہے۔ کہ یہ لڑکیاں بیچاری کانوں پر ہاتھ رکھ کر کامن روم سے بھاگ اٹھتی ہیں۔ بدقسمت لڑکی۔ باپ نے اسے مسئلہ بنا دیا ہے۔

اس کا خرچ کون دیتا ہے۔؟

وہی عزیز جنہوں نے یہاں داخل کروایا ہے۔ وہ بتاتے نہیں کہ باپ کے کسی مکان کا کرایہ اس بچی کو ملتا ہے۔ یہی دو سو روپیہ ماہانہ اور بس —— اب خود ہی سوچئے۔ اس کا پرابلم کیسے حل کیا جائے۔

اور کوئی ایسا واقعہ بتا سکیں گی آپ جو ہماری جدید نسل پر کچھ روشنی ڈال سکے۔

جدید نسل کے بارے میں آپ کیا معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ کہ یہ جاسوسی ناول پڑھ پڑھ کر اور انگلش فلمیں دیکھ دیکھ کر یہاں کیا فراڈ لگاتی ہیں۔ تو سن لیجئے۔ میرے ہاں ایک لڑکی ہے ثریا۔ یہ سوشل ویلفیر کے محکمہ میں ہے۔ بے حد شریف، بڑی کم گو۔ سنجیدہ سی اپنے کام سے کام رکھنے والی۔ ان کی روم میٹ ہوتی تھی۔ ثمینہ بڑے اعلےٰ گھرانے کی بیٹی جھنگ سے آئی ہوئی تھی۔ ایک دن اس کی ماں آئی۔ دیر سے بیٹھی اس کی شادی کا ذکر کرتی رہی۔ وہ اس کی شادی ہی کی شاپنگ کے سلسلہ میں آئی تھی۔ ثمینہ یہاں بی۔ اے کا امتحان دینے آئی تھی۔ اس کی کمپارٹ تھی انگلش میں تو یہاں ایک پرائیویٹ کالج میں داخلہ لے کر پڑھتی تھی۔

امتحان ہوئے۔ اور وہ تیسرے دن اپنا سامان سمیٹ کر چلی گئی۔ اپنا حساب وغیرہ بے باق کر گئی۔ اس کے جانے کے چار روز بعد کا ذکر ہے۔ باہر ایک فوٹو گرافر آیا۔ اس نے ثریا کے نام کی چٹ اندر بھیجی۔ کہ اپنی تصویریں لیں۔ میں پیسے لینے آیا ہوں۔ ثریا گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں نے یہاں شاید کسی فنکشن کی کسی اخبار میں چھپ گئی ہو گی۔ فوٹو گرافر اپنے پیسے بٹورنے چلا آیا ہے۔۔۔ چلو اس کے ساتھ جا کر دو دو باتیں کرتے ہیں۔

ہم وزیٹنگ روم میں پہنچے۔ تو وہ بولا۔ جی۔ وہ آپ وارڈن ہیں۔ مجھے ثریا بی بی کو ان کی تصویر دینا ہے۔ وہ آدھے پیسے دے آئی تھیں۔ ایک بڑی تصویر لے آئی تھیں۔ باقی کے لیے انہوں نے کہا تھا۔ کہ تصویریں لے کر ہوسٹل آ جانا۔ پیسے لے جانا۔

ثریا بی بی کو پہچانتے ہو ــــ؟ میں نے پوچھا۔

جی ہاں۔ میں نے تصویر بنائی ہے۔ ان کی شادی کی۔

شادی کی ــــ؟

ارے بھئی ثریا بی بی تو یہ ہیں۔ تم غلطی سے کسی اور ہوسٹل آ گئے ہو۔

یہ دیکھئے تصویر ــــ

ہمارے سامنے تصویر آئی۔ تو ہم دم بخود رہ گئے۔ وہ ثمینہ کی تھی۔ اسی شام اس کی ماں مزید شاپنگ کے لیے یہاں اُسے لینے پہنچی۔ تو یہ جان کر حیران رہ گئی۔ کہ وہ تو گھر جا چکی ہے۔ اور اس کا نکاح بھی ہو گیا ہے۔ کورٹ میں جا کر ــــ تو جان لیجئے۔ ماں بیچاری

پہ تو قیامت گذر گئی ۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کریں ۔ اس نسل پہ کیسی پابندی اور کس طرح لگ سکتی ہے ۔

ویسے آپ نے لڑکیوں کی ذمہ داری تو اٹھالی ۔۔۔ مگر خود شادی سے کیوں گریزاں رہیں ۔ ؟

گریزاں کون رہا ہے ۔۔ ؟

تو پھر ۔۔۔ ؟

بات یہ ہے کہ جب ہم لوگ ہجرت کر کے آئے ۔ تو ہم، ہمارے گھرانے مسائل میں اُلجھ گئے ۔ ہم جو اپنے والدین کی بڑی اولاد تھے ۔ انہوں نے پرابلم کو سمجھا ۔ اور والدین کا ساتھ دیا ۔ پھر جب ان سے نپٹ کر سر اٹھا کر دیکھا ۔ اپنا اور اپنے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا ۔ دنیا بہت بدل گئی ۔ اپنے ہاں کے حالات کا جائزہ لیتی ہوں ۔ تو معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ ہمارے ہاں بجلی کی ایک بھی استری نہ تھی ۔ اب ہر لڑکی کے کمرہ میں بجلی کی استری، بجلی کا پنکھا اور ٹرانسسٹر موجود ہے ۔

ہماری تفریح ۔۔۔ سڑک پہ سے گذرتے، شور مچاتے، ان ٹانگوں کو چقوں کی اوٹ سے دیکھنا ہوتا تھا ۔ جو فلموں کے اشتہاروں کو لیے سڑکوں پہ سے گذرتے ہوتے ۔ مگر اب تو حیرت ہوتی ہے ۔ یہ دیکھ کر کہ یہاں ہر لڑکی وہ پڑھتی ہے یا ملازمت کرتی ہے ۔ بلکہ جو پڑھتی ہیں ۔ وہ تو لازماً ہفتہ میں دو فلمیں دیکھتی ہے ۔ شام کو باہر گھومنے بھی جاتی ہے ۔ پہلے باہر سڑک پہ چلتے ہوئے کھانا معیوب تھا ۔ اب سرِعام کھڑے ہو کر کوک نہ پیا جائے ۔ تو جدید دور میں داخلے کی اہل نہیں کہلاتی ۔ پہلے کبھی

کنواریاں پھول نہ پہنتی تھیں۔ اب اس کنواری کو حیرت سے دیکھا جاتا ہے۔ جو موسم پر موتیے کے گجرے اور بینی نہ پہنے۔ یہ قصے تو ایک طرف۔ اب تو قمیصوں کی بانہیں ہی غائب ہیں۔

آپ کا کیا خیال ہے محترمہ! بدلتے حالات کو آپ نے مجبوراً اختیار کیا ہے ـــــ یا ـــــ صحافی خاتون نے سوال کیا۔

دیکھیے ناں بہن۔ ہم تانگوں پر سفر کرنے کے عادی تھے۔ مگر رکشا شروع ہوا تو اس میں سواری کی۔ کہ اب ضرورت اس کی ہے۔

میرے ہاں جو تبدیلی آئی۔ وہ معاشرتی اور اجتماعی ضرورت بن کر آئی۔

آپ نے تحریک پاکستان کے لیے کام کیا ہے۔ آپ بتا سکیں گی۔ کہ کیا پاکستان آپ کی امنگوں کے عین مطابق ہے۔

پاکستان وجود میں آگیا۔ ہماری جدوجہد کامیاب ہوئی۔ مگر ایک بات پر ہمیشہ دکھ ہوا۔ جب میں پاکستانی بیویوں کو پاکستان کی برائی کرتے دیکھتی ہوں۔ یا جب یہ سنتی ہوں کہ وہ ملک سے باہر جا کر خوش ہیں۔ تب مجھے یوں لگتا ہے۔ یہ ناخلف اولاد ہے۔ جو والدین، خصوصاً ماں کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ حالانکہ ماں کے قدموں تلے تو جنت ہوتی ہے۔

آپ نے کبھی کسی محکمہ سے گرانٹ لینے کی کوشش کی۔

جی نہیں۔ مجھے ضرورت نہیں۔ بھلا اپنے گھروں کے لیے دوسروں کا رہین منت ہونا کہاں کی عقل مندی ہے ـــــ؟

آپ نے بات کو حالات میں لپیٹ کر میرے سوال کا جواب ہی گول کر دیا ـــــ خیر اتنا تو بتائیے۔ کیا آپ اپنی موجودہ زندگی پر مطمئن ہیں

میں نے کہا ناں۔ کہ میں نے حالات کے سامنے ڈٹنے کی بجائے اس کے دھارے کے ساتھ بہنا شروع کر دیا ہے۔۔۔ سمجھ لیجیے۔ ہوسٹل میرا جام جم ہے۔ جس میں میں پاکستان بھر کے ہر علاقے ہر محکمے ہر ادارے کا حال ہر روز معلوم کر لیتی ہوں۔۔۔۔ انسان جب اپنی خواہشات ترک کر دے۔ تو اطمینان پا لیتا ہے۔ اب میں یہ فرض کر چکی ہوں۔ کہ میں نے یہی زندگی چاہی تھی۔ میرا فرض یہی تھا۔ جس کے لیے میرے خدا نے مجھے یہاں بھیجا۔

اس وقت آپ کے پاس کتنی لڑکیاں ہیں۔

پچیس ــــ

ماشاءاللہ۔ اچھا تو کیا آپ اخبار میں تصویر دینا پسند کریں گی؟

اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔۔

تاکہ دوسروں کو بھی آپ کے حالات جان کر اندازہ ہو کہ آپ کس حوصلہ سے حالات سے نپٹتی رہی ہیں۔ اور اب دبلی پتلی ہوتے کے باوجود کس قدر عالی ہمت ہیں۔

اور یہ ــــ کہ آپ کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ اور اس وقت تو آپ لڑکیوں پر بڑا احسان کر رہی ہیں۔ کہ یہاں انہیں اس قدر پرسکون اقامت گاہ میسر ہے۔

مگر یہ جو تصویریں اکثر اخبارات میں چھپتی ہیں۔ بڑے زوردار انٹرویو کے ساتھ اگر وہ واقعی وہی صفات رکھتی ہیں۔ جو کچھ اخبارات میں لکھا ہوتا ہے۔ تو پھر ہمارے ہاں کی ہر لڑکی ہر بیگم کو مراۃ العروس کی اصغری خانم ہونا چاہیے۔ مگر مجھے تو معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے

اور اکثر اکبری خانم کا مزاج بکھرا ہوا پاتی ہوں۔

لڑکیاں گھورے جا رہی تھیں۔ اتنا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اخبار میں تصویر چھپوانے کا۔ اور باجی نے یہ کر سارا ضایع کر دیا۔

مگر چائے کے دوران وہ کہہ رہی تھیں۔

اچھا تو یوں کیجیے۔ آج دوپہر کسی وقت یا کل اپنا فوٹوگراف بھیج دیجیے—

اخبار میں اپنی تصویر اور اپنے خیالات پڑھ کر اس نے سوچا تھا۔ شاید میری بھابی عقیلہ کو برا لگے۔ کہ وہ انتہائی پھوہڑ ثابت ہوئی تھی۔ جس میں سلیقہ نام کو نہ تھا۔ اسی لیے آئے دن میاں بیوی میں تو تکار ہوتی رہتی۔ امی کو اکثر ان کی صلح کروانے کے لیے وہاں جانا پڑتا۔ مگر اس کے مزاج اور فیشن سے نالاں رہتیں۔ وہ امی کو بھی خوب خوب سناتی۔ امی کا خیال تھا۔ اسے فیشن کی ہوا زیادہ ہی لگ گئی ہے اس لیے اسے گھر کی عزت کا خیال ہے۔ نہ وقار کا احساس۔ امی کو تو اب یہ ہول رہتا تھا۔ کہ اکبر گھر کی چخ چخ سے تنگ آکر باہر گھومتا ہے پیسہ اس کے پاس وافر تھا۔ یہ تو ٹھیک کہ عائلی قوانین کی بدولت وہ دوسری شادی تو نہ کرسکتا تھا۔ مگر اب اس کی گاڑی میں شام کو نئے چہرے ہوتے۔ اور کھانا بھی گھر میں کم ہی کھاتا۔ اکثر تکے کباب اور ہوٹلوں کے کھانوں پر گذر کرتا۔

عقیلہ اس کا سارا دوش ناجی آپا پر دیتی۔ کہ وہ نہ ہوسٹل کھولتیں نہ اکبر کو نئے نئے چہرے دیکھنے کی عادت پڑتی۔

اور ناجی سن سے رہ جاتی۔ اسے محسوس ہوتا۔ جیسے عقیلہ نے ان کی کسی بیٹی کو بڑی غلیظ سی گالی دی ہو۔

ہوسٹل کی ایک ایک بچی اسے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز تھی۔

تبھی تو جب کھانے کی ٹیبل پہ لڑکیاں فاطمہ جناح کے "مادرِ ملت" ہونے پر بحث کرتیں۔ تو وہ کہتی :۔

"ہاں — اسے مادر کہلانے کا حق ہے۔ کہ وہ پاکستانی عوام کے لیے ماں ہی کی طرح سوچتی ہے۔
مگر ایوب خاں کی حامی چیخ چیخ کر کمرہ سر پہ اٹھا لیتیں۔

"ہو گی — کنواری کو ماں کہنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ایک تو وہ شرع شریعت کی پرواہ نہ کرے۔ سنت پر عمل نہ کرے۔ شادی نہ کروائے۔ اور قوم اسے مادر کا خطاب دے ڈالے — تو یہ قوم نے اسے اسی طرح "مادر" کا خطاب دیا ہے۔ جس طرح ایک بیٹی کو "خاتونِ اول" بنا دیا ہے۔ اب دیکھو وہ باپ کے ساتھ غیر ملکی دوروں میں شریک ہوتی ہے۔

ہم نے تو یہ بھی سنا ہے۔ کہ جب پہلے دورے پر اُسے باہر لے جایا گیا۔ تو پوری پبلسٹی منسٹری میں صرف ایک شخص نے یہ پوائنٹ اٹھایا تھا۔ کہ بیٹی کو کسی حیثیت سے بیرونِ ملک جانے کی اجازت چاہیے — اس کا بل کیسے بنے —
پھر پوری کمیٹی بیٹھی۔ تو اس نے اُسے "خاتونِ اول" کا خطاب دیا۔ اور —...

خیر ملک میں یہ دھاندلیاں چلتی ہیں۔ کیا خبر۔ ان کے بعد آنے والے اپنے پورے پورے گھرانے اور حواریوں کو ساتھ لے کر غیر ملکی خیر سگالی دوروں پر نکلا کریں۔ مگر یہ جو حکومت کا دس سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ کیا ہمارے ملک ہماری قوم کو زیب دیتا ہے۔

ٹھیک کر رہا ہے۔ آخر وہ کیوں نہ بتائے۔ کہ اس نے ملک کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔

مگر پہلے وہ فہرست کیوں نہیں چھاپ دیتا۔ کہ اس کے بیٹوں نے کس قدر کما لیا ہے۔

حکومت کی کرسی پر جو بھی بیٹھے گا۔ وہ تو کمائے گا۔ اپنے گاؤں کا پٹواری اور ٹریفک کا سپاہی ہی کونسا کم ہے۔

مگر بات یہ ہے کہ خدا جب چاہے عزت چھین لیتا ہے۔ اور بڑے بڑے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ مگر پکڑتا ہے تو چھوٹے سے قصور پہ انسان کو ذلیل کر دیتا ہے۔ ایوب خاں کے بیٹوں نے کیا کچھ کیا ہو۔ مگر صرف "روٹ پرمٹ" جیسے ان کی جڑوں میں بیٹھ گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو "روٹ پرمٹ" کونسی بڑی بات ہے۔ شاید انھوں نے کتنے کارخانے، فارم اور بیرونِ ملک کیا کچھ حاصل کیا ہو۔

ہمیں تو لگتا ہے۔ یہاں کا ہر شخص غاصب ہے۔

ہاں — دراصل یہ ملک کی سوتیلی اولاد ہے۔ جو اسے تباہ کرنا چاہتی ہے۔

اخبار کا انٹرویو مصیبت بن گیا تھا۔ کہ اس کے بعد مختلف اخبار وں کی رپورٹرز پہنچیں۔ اور ہوسٹل کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی لڑکیوں کے اخلاق سے باتھ روم کی صفائی تک سب کی چھان بین کی گئی۔ اعتراض بھی ہوئے۔

آپ کتنا کما لیتی ہیں۔؟

آپ نے اسے اپنا بزنس کیوں بنایا؟

کیا پرائیویٹ ہوسٹلوں والی ساری قباحتیں یہاں موجود ہیں۔ یعنی یہ کہ پرائیویٹ ہوسٹلوں میں اکثریت کو جو شکایت ہے۔ کہ وارڈن یا منتظمہ ایسی لڑکیوں سے بہت ڈرتی ہیں۔ جو باہر پھرنے پھرانے والی ہوں۔

کیا آپ بھی لڑکیوں سے تحائف لے کر اُن کے والدین کو "سب اچھا" کی تسلی دیتی رہتی ہیں۔

کیا آپ کے ہاں سے بھی لڑکیاں شام کو باہر گھومنے جاتی ہیں۔ اور واپسی پہ اپنے بوائے فرینڈ سے حاصل کی ہوئی کون بار چرغ میں آپ کو بھی حصہ دار بناتی ہیں۔؟

توبہ۔ اللہ۔

میری بات تو سنیئے۔ بھئی یہاں کوئی قباحت نہیں۔ یہاں بزنس

بھی نہیں۔۔ ہر پرائی لڑکی کے اپنے صوابدید پہ ہے۔ وہ اپنے اعمال کی خود محافظ ہے۔ اور جواب دہ بھی۔

مگر آپ بُری لڑکیوں کو کس طرح پہچان سکتی ہیں۔

یہ جو لڑکیاں گروپ بنا کر پکچر یا شاپنگ کے لیے جاتی ہیں۔ آپ کو کیا پتہ۔ ان میں سپلائر کون ہے۔ اور لڑکیوں کو کدھر لے کر جا رہی ہیں۔

اس رات کامن روم میں بڑی گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔

مگر یار ___ یہ پرائیویٹ ہوسٹل بدنام کیوں ہیں۔

کہ وہاں احمدی بیگم کی طرح کی لڑکیاں بھی ٹھاٹھ سے رہتی ہیں

احمدی کا ذکر نہ کرو ___ وہ تو ہر ہوسٹل سے نکالی جا چکی ہے

ہاں ___ اُسے کون نہیں جانتا۔ کہ اس کا تعلق ایسے گروہ سے ہے۔ جو ملک کا ناجائز کاروبار چلاتے ہیں۔

یوں کم بخت برقع پہنتی ہے۔ اور رہیں باتیں کرتی ہے۔

برقع تو وہ اس لیے پہنتی ہے۔ کہ اپنا منہ چھپا کر دوسروں کا منہ کالا کرے۔

ماڈل ہوسٹل سے وہ کس طرح نکالی گئی تھی تو بہ۔

ہاں اسی واقع کے بعد تو ہم نے ہوسٹل چھوڑا تھا۔

ہمارے ساتھ والے کمرے میں تو چوری ہوئی تھی۔ نصرت کی اس کی سونے کی بالیاں اور روپے چوری ہوئے تھے۔ وارڈن اور سیکرٹری باجی طاہرہ نے جب سب کے بکس کھلوائے۔ تو احمدی کے بکس میں روپے اور بالیوں کے علاوہ ایسی ادویات اور اشیاء بھی برآمد

ہوئیں۔ جنہیں فیملی پلاننگ کے کسی کلینک میں ہونا چاہیئے تھا۔

سچی ـــ

ہاں۔ ہاں۔

وارڈن نے بکس اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اور اُسے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ تو جناب دھمکی کیا دیتی ہے کہ ـــ میرے واقف کاروں کو آلینے دو۔

تمہاری لڑکیوں کو دن دہاڑے اُٹھا کر لے جائیں گے۔ اس کے بعد ہُوا بھی یہی۔ کہ اکثر کاروں میں وہاں لڑکے گھومتے۔ اور آتی جاتی لڑکیوں کے دوپٹے اور پرس چھینتے۔ اور سرِعام انہیں سیر پہ چلنے کی دعوت دیتے۔

ماڈل ہوسٹل ہے بھی بڑی سڑک سے کافی ہٹ کر بس سٹاپ خاصا دور تھا۔

اس لیے ہم نے تو عافیت سمجھی کہ اسے چھوڑ ہی دیا جائے۔

ویسے سنا ہے خانم کے ہوسٹل میں ایسی لڑکیوں کی بڑی کھپت ہے۔

اس کا تو کاروبار ہی اور ہے۔ باقاعدہ کمیشن اور پتی لیتی ہے۔ وہ تو ـــ اور ایسی لڑکیوں کو تو آنکھ کا تارا بنا کر رکھتی ہے۔

مگر لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے ـــ

اس میں لڑکیوں کا کیا قصور ـــ پوری قوم سزا وار ہے۔

نہیں۔ ہم اپنا معیارِ زندگی بلند کر رہے ہیں۔

معیار زندگی جائز طریقوں سے بھی بلند ہو سکتا ہے۔
مگر وہ راتوں رات بلند نہیں ہو سکتا۔
لعنت ایسے معیار پر۔
اسی لیے تو ہر گھر میں چرچا ہے۔ کہ وہ پہلی سی برکت نہیں رہی۔
مگر ملک تو خوش حالی کا ڈنکا پیٹ رہا ہے۔
یہ ڈنکا پیٹنے والے کون سے سارے اچھے ہیں۔ ان کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔
ہماری ایک امریکن دوست ایک دن پوچھنے لگی۔ کہ تم لوگ سمگلروں کو حاجی کیوں کہتے ہو۔
جب میں نے اسے اس سوال کی وضاحت چاہی تو کہنے لگی۔
اکثر نیوز پیپر میں سمگلروں کو حاجی کہہ کر آگے نام لکھا ہوتا ہے۔
وہ تو علیحدہ بات ہے۔ مگر ایک چیز ہے۔ کہ حج خود ایک کاروبار بن چکا ہے۔ آج کل تو اکثر لوگ باہر کی سیر کرتے، سونا اور سچے موتی خریدنے اور غیر ملکی کپڑا خریدنے کے لیے ساتھ ساتھ حج بھی کر آتے ہیں۔ کہ ہم خرما اور ہم ثواب۔
اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہمارے علمار دین کا اخلاق پست ہو چکا ہے۔ کہ اب ان کی درس و تدریس میں اثر نہیں رہا۔ کہتے ہیں۔ ایک دفعہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی۔
میرا بچہ گڑ کھاتا ہے۔ اسے منع کریں۔
آپ نے کہا۔ بچے کو کل لے کر آنا۔

چنانچہ وہ خاتون دوسرے دن پھر حاضر ہوئی۔ بچے کو حضور کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے بچے کو دیکھا اور فرمایا۔

بچے گڑ نہ کھایا کر۔

خاتون حیران ہوئی۔ اور کہنے لگی۔ حضور! اتنی سی بات تھی۔ تو آپ نے کل ہی کیوں نہ کہہ دیا۔

آپ نے فرمایا ــــ کل میں نے خود گڑ کھایا تھا۔

اور آج کے علماء رات رات بھر لانبی تقریریں کرتے ہیں۔

دوسروں کو ہدایات اس طرح کرتے ہیں۔ کہ بس خود وہ اپنی مثال پیش کر رہے ہیں۔ مگر ہوتا اس کے برعکس ہے

آج کل کے عالم دین تو سرکاری محفلوں میں شراب تک پیتے دیکھے گئے ہیں۔

مگر یہ سوشلزم کا نعرہ لگانے والے کیا کہتے ہیں۔

ملک کی تباہی . . .

نہیں ــــ وہ ملک سے سرمایہ داری کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ پھر یہاں لڑکیوں کو احمدی نہ بننا پڑے۔

مگر اس ملک سے سرمایہ داری اس وقت ختم ہوگی۔ جب سرمایہ دارانہ ذہنیت کا خاتمہ کیا جائے۔ گوتم بدھ راجہ تھا۔ اس نے خود راج پاٹ چھوڑا تھا۔ پھر لوگوں کے ذہنوں میں سے سرمائے اور بڑائی کی ہوس ختم کرنے کا درس دیا تھا ــــ مگر آج کے لوگ۔

وہ کہتے ہیں۔ حکومت ہمیں دو ــــ تو ہم تمہیں۔ غریبوں سے محبت کر کے دکھاتے ہیں۔

یہاں تو ہر آنے والا اپنوں اپنوں کے پیٹ بھرتا ہے۔ اس وقت سب اپنے نعرے بھول جاتا ہے۔

یہاں تو جو آئے گا۔ ایسا ہی کرے گا۔

بلکہ ہر آنے والا خالی پیٹ آئے گا۔ پہلے اپنا بھرے گا۔ پھر اپنے عزیزوں کا۔ اس کے بعد عوام کا خیال کرے گا۔

نہیں، ہم ایسے لیڈر کو کبھی پسند نہیں کریں گے۔ جو اپنے بچوں کو روٹ پرمٹ دے دیئے۔

شاید آنے والا لیڈر — پوری بسیں، مالکوں سے چھین لے۔ یہ تو حالات بتائیں گے۔۔ ویسے عوام کی بھی سمجھ نہیں آتی۔ آج ایک کو سر پہ چڑھالیں گے۔ کل اسے کتا کتا کہتے بازاروں میں نکل آئیں گے۔

بہرحال ہم ایسے لیڈر کو پسند نہیں کرتے۔ جو — ہماری پسند ناپسند سے کیا ہوتا ہے۔ اب جو جشن منایا جارہا ہے۔ اس سے قبل وہ جو کتاب چھپی تھی۔ فرینڈز ناٹ ماسٹر۔ تو ہم سے پوچھا گیا تھا۔

یہ تو دور ہی ایسا آگیا ہے کہ:۔

سلطانی بھی عیاری ہے۔ درویشی بھی عیاری۔

مگر یہ جشن کی تک۔ کیا ہے۔ سمجھ نہیں آتا۔

یہ — ہمارے بیلوں، گدھوں، گھوڑوں کے لیے مال روڈ پر سیر کا پروگرام ہے۔

نہیں — سنجیدگی سے بات کیا کرو۔ یہ سب کچھ

سرخ انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔

اعلانِ تاشقند پر خاصے لوگ برہم ہیں۔ اب انہیں بولنے کا موقع ہاتھ آگیا ہے۔

ابھی تو ہمارے شہیدوں کا خون بھی خشک نہیں ہوا۔ اور یہ جشن منا رہے ہیں۔

حد تو یہ بھی ہے۔ کہ شہیدوں کی بیوگان کو جشن کی تقریبات میں بلایا جاتا ہے۔

حد تو یہ بھی ہے۔ کہ ہمیں زبردستی جشن منانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

ہر دفتر۔

ہر گھر۔

ہر محکمہ۔

ہر ادارے۔

ہر فرد پر جشن سوار ہے۔

رسالہ اٹھا کر دیکھ لو۔

غزلیں پڑھو۔

نظمیں سنو۔

ریڈیو کے فیچر ہیں یا تقریریں

اللہ — پوری قوم اس وقت جشن کی لپیٹ میں ہے۔

مگر قوم کو یہ کیوں نہیں بتایا جا رہا۔ کہ جنگ کے بعد یہ پیسہ کہاں سے آیا ہے۔

پیسہ تو ہماری ہی جیبوں سے آ رہا ہے۔ ترس آتا ہے بچوں کو چندہ منگاتے۔
بچوں کو جشن کا چندہ ——
ہاں - ہاں - سب سکولوں میں (ایک ساتھ سب معلمات بولتیں) مینا بازار ہوں تو چندہ بچے لائیں۔
چیزیں بھی لائیں - کئی سکولوں میں تو - بیسن - چنے کی دال - چنے آلو - چائے - چینی - دہی وغیرہ چیزیں منگوائی گئی ہیں - اور اُون کپڑا وغیرہ علیحدہ . . . اور پھر بچے یہ چیزیں خریدیں بھی خواہ کھانے کی ہوں یا یہ میز پوش، ٹی کوزیاں - بچوں کا جلسہ ہو تو قوالی ضرور ہوتی ہے - اس آئٹم کیلئے ساٹن کی رنگی ٹوپیاں، اور کوٹیاں بھی ضروری ہیں - اور دو چار گوٹا کناری الگ سے - سٹیج سجانا - ٹیبلو کے لباس -
ہمارے سکول میں تو دو دو تین تین ٹیبلو ہوتے ہیں - بچوں کے جلوس - پروگرام سب پہ پیسہ لگتا ہے -
مگر یہ خرچ حکومت نہ برداشت کرے گی - کہ واہ واہ تو اس کی ہو رہی ہے -
گرانٹس تو ہر سکول کو ملی ہیں - مگر روپیہ اوپر ہی اوپر غائب ہو جاتا ہے - چھوٹے سکول تو ہر خرچ خود برداشت کرتے ہیں - مگر احساس تو یوں ہوتا ہے کہ عوام پہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ اخراجات ڈالے جا رہے ہیں - کہ وہ حکومت سے متنفر ہو جائیں -
مگر - ہمارا صدر —— آخر اپنے مشیروں کو بدلتا کیوں نہیں - ؟

حالانکہ وہ سب فرینڈز ناٹ ماسٹرز ہیں۔

ارے ارے۔ تمہیں حکومت کا ایک لطیفہ سناؤں۔

ہمارے ایک وزیر لے چند روز ہوئے۔ کینٹ میں جلسہ کیا۔ جلسہ شروع ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک منچلے نے نعرہ بلند کیا۔

اوئے — ٹرک تے واپس ٹرچلیا اے۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے جلسہ گاہ خالی ہو گئی۔

تو ہر جگہ کرائے کے آدمی ہوتے ہیں۔

اور اتنا بے کار کون بیٹھا ہے۔ کہ پہروں کھلے میدانوں میں جما بیٹھا رہے۔

وزیروں کے ذمے ہوتے ہیں۔ کہ کتنے کتنے ٹرک آدمی انہوں نے بھجوانے ہوتے ہیں . . .

مگر —

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا۔

یارو - انقلاب آکر ہی رہے گا۔
کھانے کی میز پہ اصغری نے مکا مار کر نئی خبر سنائی۔
خیریت —
نہیں —
کیوں —
مجھے آج روس کے عوام یاد کر رہے ہیں۔ جنہوں نے زار کو ختم کر دیا تھا۔
مگر بات بھی کچھ —— تم تو ۶۵ء کی جنگ میں کبھی نروس نہیں تھیں ہوئیں۔ آج کیا ہو گیا۔
یہ —— کہ آج میں نے اپنی آنکھوں سے ایک منظر دیکھا ہے ایجوکیشنل آڈیٹوریم کے باہر، مجھے اس نے دکھایا ہے۔ وہ صحافی خاتون —— جس نے باجی کا انٹرویو لیا تھا۔
بینا —— نے —
ہاں —
کیا —
ایجوکیشنل آڈیٹوریم میں آج بچوں کا تقریری مقابلہ تھا۔ اور وہ باہر کھڑی آنے والے بچوں سے انٹرویو کر رہی تھی۔

معاً ایک بچہ زور زور سے رونے لگا۔
اسے ماسٹر کہہ رہا تھا۔
"چل بے نکال پیسے، اپنی ماں سے کیوں نہ کہا تھا۔
کہ ایوب خاں اپنا ولیمہ رچائے بیٹھا ہے۔ اور یہاں
قدم قدم پر تمہیں سلامیاں دینی ہیں —— اور اس کے
حواریوں کو بھی ویلیں دینی ہیں۔
بچہ روئے جا رہا تھا۔ وہ گھر سے پیسے نہ لا سکا تھا۔ اس کی ماں مزید چندہ نہ دے سکتی تھی۔ اور بچے بھی کہہ رہے تھے۔ کہ آئندہ تو گھروں سے ہمیں کبھی پیسے نہ ملیں گے۔
تب مجھے اس خاتون صحافی نے کہا تھا۔
دیکھو —— بہن! فضا کو سونگھو۔
کیا تمہیں بھی انقلاب کی بو نہیں آ رہی ہے۔؟
اور پھر اس نے بڑے حوصلہ سے ان وزیر صاحب سے بھی جا کر کہہ دیا۔ جو وہاں صدارت کرنے آئے تھے۔ اور گہرے جامنی رنگ کے بروکیڈ کے لباس والی جھینپی جھینپی سی اپنی بیگم کو نروس ہونے سے بچانے کے لیے انہی کا لطیفہ سنا رہے تھے۔ کہ ایک بار ان کی بیگم کو ایک سکول کی ہیڈ مسٹرس اپنے کسی جلسہ میں لے گئیں۔ دوسرے دن اخباروں میں تقریر سمیت ان کی صدارتی تصویریں شایع ہوئیں۔ تو میں نے پوچھا
نیک بخت —— یہ کاروبار کب سے شروع کیا۔
کہنے لگیں۔ میں تو کرسی پر بیٹھی تھی۔ میرے سامنے جو استانی تقریر کہہ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ کہ وزیر صاحب کی اہلیہ یا بیگم یہ فرما رہی ہیں

مگر مزے کی بات یہ ہوئی۔ کہ اسی ہفتہ ان کے دادا ابا کا خط آیا۔ گاؤں سے لکھا تھا۔

"برخوردار خود تو جو چاہو کرو، وزیر یا تدبیر ہو۔
مگر ہماری بہو کو کیوں جلسوں میں گھسیٹ کر اس کا
خانہ خراب کر رہے ہو —"

چائے کی ٹیبل پر قہقہے پر قہقہے پڑنے لگے۔ کہ وزیر صاحب ہنس رہے تھے۔ اپنی چائے کی پیالی تھام کر سننے والوں کے بیچ سے راستہ بناتی وہ خاتون آگے بڑھی اور بولی۔

"محترم! ذرا باہر جا کر دیکھئے — آپ کا جشن سرخ
انقلاب کا پرچم لہرانے کو ہے۔ باہر ننھے ننھے بچے رو
رہے ہیں۔ کہ ان کی ماؤں کے پاس اب چندہ دینے کو
کچھ نہیں رہا۔
دیکھئے محترم۔ مجھے ان بچوں کے آنسوؤں میں گیلے
بارود کی بو آ رہی ہے۔"

لڑکیو! خود ہی سوچو۔۔ جب یہ بارود خشک ہو گیا — تو

تو۔۔۔۔

تو۔۔۔۔

تو۔۔۔۔

لڑکیاں فضا میں بارود کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی تھیں

اور عجیب بات ہے۔ کہ باصرہ نے یہاں کسی بھی بات میں حصہ نہ لیا تھا۔ وہ ٹیبل سے اٹھ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور بستر پر اوندھی لیٹ گئی۔

اپنی جدوجہد میں ناکام ہو کر لڑکیاں ہمیشہ ہی سے اپنے بستروں میں اوندھی لیٹ کر روتی ہیں۔ جانے یہ دستور کب بدلے گا۔ یہ لڑکیاں جو مردوں کے دوش بدوش چلنے کا عملی ثبوت پیش کر چکیں۔ اپنی اس عادت میں تبدیلی کیوں نہیں لاتیں۔

باصرہ بڑی چپ چاپ لڑکی تھی۔ بہت پہلے اس کا منگیتر اُسے اس وجہ سے چھوڑ گیا تھا۔ کہ یہ لوگ "اڈوانس" نہ تھے۔ باصرہ سفید لٹھے کا برقع پہن کر سکول جاتی۔ اس کی ماں بھی سفید برقع پہنتی ہے شٹل کاک کی طرح۔ اور اس کے ابا کے پاس گفتگو کا صرف ایک موضوع ہے۔ "دین اسلام"۔

مگر باصرہ نے مجھے بتایا تھا۔ کہ جب وہ اپنا قصبہ چھوڑ کر لاہور آئی ہے۔ تو اس کے جی میں اپنے منگیتر سے انتقام لینے کا کوئی جذبہ نہ تھا وہ صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی۔ کہ وہ شہر کی لڑکیوں سے کس قدر پیچھے ہے۔ یا یہاں کی لڑکیاں اس سے کس قدر فرق میں ہیں۔ یہ فرق بھی اس پر آتے ہی کھل گیا تھا۔ جب وہ معلمی کے لیے انٹرویو دیتے ہوئے بار

بار اپنے دوپٹے کا پلو مروڑ رہی تھی۔ اور ادارہ کے مینجر کے سامنے بے حد جھجک رہی تھی۔ اسے یہ احساس بھی تھا۔ کہ ان اتنی ساری لڑکیوں میں اسے کبھی بھی سلیکٹ نہیں کیا جائے گا۔ مگر اپنی تقرری کا پروانہ دیکھ کر وہ مارے حیرت کے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ یہ حقیقت اس پر بہت بعد میں کھلی۔ کہ مینجر نے اسے اس لیے سلیکٹ کیا تھا۔ کہ قصبے سے نئی نئی آئی ہے۔ وہ یہاں لڑکیوں کو فیشن سکھانے کی بجائے محنت کروائے گی۔

رہنے کا مسئلہ بھی اسی سہیلی نے حل کر دیا تھا۔ جس نے یہاں تک اس کی راہ نمائی کی تھی۔ اس کی سہیلی نے بتایا تھا۔ کہ شہر میں ہر جگہ پرائیویٹ ہوسٹل کھلے ہیں۔ یہ ٹھیک کہ خرچ زیادہ ہے۔ مگر ٹیوشنیں بھی تو مل جاتی ہیں۔

والدین جبار اور اس کی ماں کے جواب کی تلخی اور سنگینی سے تا حال نپٹ نہ سکے تھے۔ اس لیے بہتر ہی جانا۔ کہ اسے شہر بھیج دیا جائے۔ اگر اس کا نصیبہ نہ کھلا۔ تو دوسری چھوٹی لڑکیوں کے لیے تو راستہ کھول ڈالے گی۔

تاجی آپا سے مل کر اُسے بے حد اطمینان ہوا تھا۔ کہ اس شہر میں ایسی لڑکیاں بھی رہتی ہیں۔ تاجی آپا کی ڈھلتی عمر، آنکھوں تلے کے سیاہ حلقوں میں زندگی کی تنہائیوں اور ویرانیوں کا عکس دیکھ کر اس نے نہ جانے کیوں یہ باور کر لیا تھا۔ کہ جوانی میں ضرور تاجی آپا کے منگیتر نے بھی اسے چھوڑ دیا ہوگا۔

اپنے کمرے میں جست کا بکس رکھ کر اوپر لیٹے کا پرانا مگر گھر کا دُھلا

ہوُا نیل لگا میز پوش ڈالتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

آج سے چند برس بعد میں بھی تاجی آپا کی طرح نظر آؤں گی۔ میرے چہرے پہ دم توڑتی حسرتوں کے سائے اسی طرح کانپا کریں گے۔ پہلے دن اس نے رات بھر سوچا تھا۔

بھلا جبار تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ وہ اچھا بھلا جانتا تھا۔ کہ ہم ایک ہی طرح کے گھرانے کے ہیں۔ جب میں نے تمہاری فرمائش پہ پرائیویٹ طور پر میٹرک پاس کر لیا تھا۔ تو تمہاری ماں میری تعریفیں کرتی نہ تھکتی تھی۔ پھر میں پرائیویٹ پڑھ پڑھ کر بی۔ اے کر گئی۔ اور اب جبار تم کہتے ہو۔ کہ صرف امتحان پاس کر لینے سے کیا ہوتا ہے۔ لڑکی نے کم از کم کالج کا منہ تو دیکھا ہو۔ کالج لائف میں ایک جاذبیت ہے۔ ایک حسن ہے۔ کم از کم انسان میں کچھ Manners آ جاتی ہیں۔

جبار۔ تم بھی کیسے عجیب ہو۔ کاش تم جان سکتے۔ اپنے گھر میں اپنی عادات و صفات اپنانے کے سلسلہ میں میں نے چھوٹے بہن بھائیوں کے کتنے مذاق سنے تھے۔ کہ کسی سے چیز پکڑتے ہوئے میں نے پہلے پہل "تھینک یو" کہنا شروع کیا تھا۔ اس پر سب نے کیا کیا کہا تھا۔ مگر اماں میرے آڑے آئی تھی۔ انہوں نے چولھے کے قریب چوکی پر بیٹھے بیٹھے اپنی اسی لائق بیٹی کو بنظر تحسین دیکھا تھا۔ اور رنجھو، جھمو، جادی، جیدی کو ہدایت کی تھی۔

اچھی بات ضرور سیکھنی چاہیئے۔ باچھو کی بات تو سب کے لیے فائدہ مند ہو گی۔ میری اتنی لائق فائق بیٹی ہے۔"

دکتنی بھی نالائق بیٹی کا رشتہ طے پا جائے۔ وہ قابلیت کی سند بن جاتا ہے۔ مگر باصرہ نے تو ان دنوں ایف۔ اے پرائیویٹ طور پر پاس کیا تھا)

پھر جو لڑکیاں کالج میں پڑھنے کے لیے شہر جا کر داخل ہوئی تھیں ان سے بی۔ اے کے نوٹس لینے کے علاوہ فیشن کے اقتباسات بھی باقاعدگی سے حاصل کیے تھے۔ اور ہمیشہ تنہائی نے اسے سہارا دیا تھا۔ کہ تم جبار کا پورا پورا مقابلہ کرو گی۔

اس نے پرانی قمیضوں کے گھیرے سے نکال نکال کر پرانی کرسیوں کی پشت کے غلاف بنائے تھے۔ امی کا اور اپنا سفید برقع دوہ ابھی پرانا ہی کب تھا) پھاڑ کر نماز والی چوکی کا جھالروں والا غلاف بنایا تھا۔۔

یہ کیا ـــــ؟ اس نے اپنی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو پونچھ کر برآمدے کی سرگوشیوں پہ کان ٹکا دیا۔

استانی ہے۔

یعنی ہماری اس جدید نسل کو پڑھانے آئی ہے۔ جو ذہانت میں ہم سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔

پرائیویٹ۔ بی۔ ٹی کرنا چاہ رہی ہوگی۔

مگر بی۔ اے تو کالج کے پیچھے بیٹھ کر کیا لگتا ہے۔ اسی لیے تو بی۔ ٹی کی سند جھونکے میں لینے آئی ہے۔

اور تم فکر نہ کرو ـــ یہ تو خیر ملازمت کرنے آئی ہے۔ یہاں تو پڑھنے کے لیے آئیں۔ تو تیسرے دن جون بدل لیتی ہیں۔ یاد رکھنا۔

اگر سیالکوٹ سے آئی ہے۔ تو برقع ایک ماہ بعد اتارے گی۔ مگر دوپٹہ کھول کر استری کرکے لیا کرے گی قمیض ہمیشہ اپ ٹو ڈیٹ پہنے گی۔ بال کٹوانے سے قبل ذرا اگت کھول کر گھوما کرے گی۔ پہلی تنخواہ میں سے ٹیفٹے کا پلین سوٹ سلوائے گی۔ دوسری میں سے اپنی تصویر کھنچوا کر یا بی۔اے کی ڈگری والی ہی فریم کروا کر الماری میں سجائے گی ——

اور اگر بہاول پور سے آئی ہے تو ——

برقع اتارنے سے قبل بال کٹوائے گی۔ بغیر آستین کی قمیض ضرور سلوائے گی۔

سرگودھا سے ہوگی تو شمیض کے بغیر باریک قمیص پہنے گی مگر بازو پورے ہوں گے۔ بلکہ کف دار۔ ہفتہ بھر بعد ہی کی "زنانہ بیوٹی کلینک" کا پتہ پوچھے گی۔

ملتان کی ہوتی تو دوپٹہ، کرتا، میز پوش آرہ کی کڑھت سے سجے ہوتے۔ یا کانوں کا زیور چغلی کھاتا۔ کہ . . .

جھنگ کی ہوتی ۔ تو میٹھے میٹھے انداز میں بولتی ۔ ہماری بحث میں حصہ لیتی۔

گھر سے اداس زیادہ لگتی ہے۔

ماں نے آج ہی بوتل چھڑائی ہوگی —

چھنی منگوا دو بازار سے۔

ہشت، وہ جاگ رہی ہے ۔

اچھا ہے ۔ ہماری باتیں سن لے ۔

باصرہ کے علاوہ یہ سب باتیں تاجی آپا نے بھی سنی تھیں ۔ اور وہ محسوس کر رہی تھیں کہ لڑکیاں اپنی بکواس میں آنے والی لڑکیوں کے تجزیئے خوب کر رہی ہیں ۔ کہ ان کے کمرے کی بڑی وارڈرڈب میں جو مختلف خانے تھے ۔ ان میں مختلف پرزوں پہ لڑکیوں کے نام اور ان کپڑوں کی تفصیل لکھی ہوئی تھی ۔ کہ لڑکیاں اپنے گھروں کو جاتے ہوئے اپنے "موڈرن لباس" مصنوعی بال، جوڑے گنتیں ۔ ان کے پاس امانت رکھ جاتی تھیں ۔ اور اپنے گاؤں اپنے علاقے کا لباس پہن کر جاتی تھیں ۔ برقع اوڑھ کر بلکہ نائلون کی ٹوکری میں برقع استری کر کے تہ کر کے رکھتی ہیں ۔ اخبار خواتین اور ایک دو ڈائجسٹ قسم کے رسالوں تلے ۔ اور گھر کے قریبی سٹیشن پہ نکال کر پہن لیتی ہے ۔ شاید یہ نئی لڑکی کسی روز اپنے چند کپڑے اپنے چند جوڑے اٹھا کر الماری میں رکھنے کو آئے ،

باصرہ نے آنکھیں موندے سوچا تھا ۔ کیا جبار یہی چاہتا تھا ۔ کہ کالج اور شہر جا کر میں بہ ۔ یہ والے (Manaus) سیکھوں بہر حال اس نے پکا عہد کیا تھا ۔ کہ اب شہری زندگی کا گہرا مطالعہ کروں گی ۔

شہری زندگی کا مطالعہ اس نے سعدیہ کے ساتھ پروگرام بنا لیا لیا تھا ۔ کہ اس نے بھی شہری لڑکیوں کو بڑے قریب سے دیکھا تھا ۔ سعدیہ کا المیہ یہ تھا ۔ کہ اس کے ہاں ہفتہ میں دو تین بار مہمان آتے اسے دیکھنے ۔ اسی روز امی باہر کا چبوترہ تک دھلوائیں ۔ گھر بھر میں اگر بتیاں جلائی جاتیں ۔ چائے کی ٹرے سجتی ۔ بلکہ بدلتے حالات و فیشن

کے ساتھ سعدیہ، سمیرہ (کہ اس کی چھوٹی بہن) نے چاسٹ بنانے۔ دہی بھلوں کی ڈش سجانے کے نئے نئے طریقے سیکھے تھے۔ جب مہمان بیبیاں آتیں۔ آنے سے قبل۔ بجو لڑکی ہمیشہ نوید دیتی۔

بس بی بی، انھوں نے کہہ دیا ہے۔ ہمیں لڑکی پسند آگئی۔ تو شگن کر کے اٹھیں گے۔ انہیں چاہیئے بھی صرف لڑکی اچھی شکل کی اچھے سلیقے والی۔ نیک شریف گھرانے کی۔"

اماں اس دن بڑا مدبرانہ لباس پسند کرتیں۔ بیبیاں آتیں تو اماں کمال شفقت و احترام سے آؤ بھگت کرتیں۔ باتیں ہوتیں۔ اور پھر کسی لمحہ سعدیہ کو پکارا جاتا۔

سعدیہ بی بی! ارے بھئی تم نے ابھی تک چائے بھی تیار نہیں کی ——"

مہمان بی بی چونک کر کہتی۔ نہیں بہن۔ ناحق آپ تکلیف کرتی ہیں۔ مگر درونِ سینہ خوشی کی لہر ابھرتی۔ لڑکی آرہی ہے۔

سعدیہ آرزوؤں کی ٹرے اٹھائے جھکی جھکی اندر داخل ہوتی۔ چائے کے دوران اس کی تعلیم سے معلمی تک کے مختلف سال پوچھ کر آنے والی بی بی اس کی عمر کا حساب کرتی۔ پنجابی اور اردو فلموں۔ ایکٹرسوں، ایکٹروں کے بارے میں پسند ناپسند پوچھتی۔ باورچی خانے کے سلیقے سے ہمشینی کڑھت تک کا پوچھ ڈالتی۔

جب جانے لگتیں تو بجو لڑکی علیحدہ ہو کر امی سے دس پندرہ روپے آج کی دہاڑی لے کر چلتی بنتی۔ کبھی پلیٹوں میں سے سموسے

اور مٹھائی بھی اٹھا کر جھولی میں ڈال لیتی۔

پھر چند روز بعد ان صاحبہ کی برائی کرتے ہوئے وارد ہوتی۔ اور دوسری پارٹی کے آنے کی خبر سناتی۔

اماں نے تو تنگ آکر بچولڑی بھی بدل ڈالی تھی۔ مگر دوسری کے تھیلے میں سے بھی اسی طرح کی کاپی اسی قسم کے ایڈریس اور تصویریں تھیں۔ بچولڑیوں کا یہ جال کچھ اس قسم کا بنا ہوا تھا۔ کہ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ان کا سرا ایک تھا۔ ان کے وہی دام تھے۔ اعلے سول افسر، فوجی افسر۔ کارخانے والے۔ تاجر۔ انجینئر۔ وکیل۔ سب رشتوں کی علیحدہ علیحدہ فیس تھی۔ پھر ہر بار کبھی کپڑے، کبھی جوتی کی فرمائش علیحدہ سے۔ ہر آنے والے رشتے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد ڈھیر سی برائیاں بیان کر دینا۔

حد تو یہ تھی کہ گھر آنے والوں کو کبھی تو یہ کمی لگتی۔ کہ بیٹھک میں قالین تک نہیں ہے۔ صوفے اس قدر پرانے ہیں۔ جیسے ماں کا جہیز۔

گھر کا معیار تو یوں ہی سا ہے۔ مگر سکول میں تو سعدیہ یوں لگتی ہے جیسے کسی نواب کی حویلی سے آتی ہے۔ شوقیہ ملازمت کرنے۔

ایک دن تو ایک بی بی نے انہی کے گھر بیٹھے بیٹھے بات سنائی۔ کہ یہ بچولڑیاں بھی بہت غلط سلط جگہ لے جاتی ہیں۔ ہمیں ایک دن ایک لڑکی دکھائی کسی کے گھر۔ لڑکی بڑی سمارٹ بڑی ساڑھی وغیرہ پہنی ہوئی سیٹ کیے ہوئے بال۔ بڑے ملائم لہجے میں بات کرتی ۔ ۔ ۔ میں لڑکی

پر لٹو ہوگئی - اور کہا کہ چل اب اس کا گھر بھی دکھا - مگر جب گھر گئے ہائے توبہ - گوالمنڈی کے قریب ایک گلی میں تیسری منزل کے دو کمروں میں شاید وہ رہتی تھی - اندھیری سیڑھیوں میں بندھی موٹی تار کو ٹٹول ٹٹول کے اوپر گئے - اور سانس سیدھا کرنے کو ایک چارپائی پر بیٹھنا چاہا - جہاں لحاف پڑا تھا - تو اندر سے ایک مرغی کڑ کڑائی - اتنے میں صاحب زادی کی ماں آگے بڑھیں - اور بولیں -

ہماری مرغی کڑک ہو رہی ہے - یہاں انجم کے بستر پہ انڈا دیا کرتی تھی - یہاں ہی کڑک بیٹھ گئی ہے - پھر بچولڑی سے بولی -

بتا کر تو لاتی کسی کو - نیچے والوں کی بیٹھک میں بٹھا دیتے -

اور ہم وہاں سے پانی پیے بغیر واپس آگئے - - - -

سعدیہ کو معلوم تھا - کہ اتنی لمبی کہانی اُسے اسی لیے سنائی گئی ہے - کہ وہ منہ پہ خود اس کی برائی نہیں کر پائے - - - - یوں ہر آنے والی! سعدیہ کے ماحول اور جہیز کی کمی کے خوف میں الجھ کر اس کا سارا حسن سارا سلیقہ بھول جاتی - اس لیے اب تو سعدیہ پر کئی بار مایوسی کے بڑے شدید دورے پڑے تھے - اور جی لگانے کو وہ ہر نئی پنجابی فلم ضرور دیکھتی تھی -

پنجابی الھڑ مٹیار کو تھرکتے، گستاخیاں کرتے دیکھ کر اُسے دلی خوشی ہوتی - جیسے وہ اس کی محرومیوں کے بدلے بھی چکا رہی ہو اور وہ دل کھول کر داد دیتی - - قہقہے پر قہقہہ لگاتی -

فلم کے دوران، آئس کریم، نان کباب، چائے، آلو کے قتلے یا چاکلیٹ وغیرہ کا شغل بھی چلتا - بڑھتے ہوئے اخراجات کے لیے

اس نے ٹیوشنیں پڑھانا شروع کر دی تھیں۔ ٹیوشنوں کا حساب بھی خوب تھا۔ اکثر ان پڑھ والدین اپنے حصے کی تعلیم کا خرچہ بھی اپنی اولاد پہ پورا کرنا چاہتے تھے۔ ہیڈ مسٹرس ہر معلمہ سے ہر بچی کی کمیشن طے کر لیتی۔ اور صبح سکول شروع ہونے سے قبل آدھ گھنٹہ اور آدھ گھنٹہ بعد معلمات ڈھیری بچیوں کو ٹیوشن پڑھاتیں۔ جیسے ہر بچی کند ذہن ہے۔ یا اُسے والدین کی کمائی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ لڑکیاں بھی اپنے آپ کو انتہائی موڈرن ظاہر کرتیں۔ وہ ٹیوشن کے وقت اپنے بیگ میں سے رنگین دوپٹے نکال کر اوڑھ لیتیں۔ اور ہونٹوں پہ لپ اسٹک سجا لیتیں۔ وہ ہر نیا کپڑا پہننے میں ہی فخر محسوس کرتیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی۔ کہ پاکستان میں لوگوں کے پاس پیسہ کہاں سے آتا ہے۔۔۔ کہ تعلیمی اداروں میں برپا ہونے والی تقریبات میں ہر لڑکی نیا لباس پہن کر شامل ہوتی۔ اب تو ہر فرد ہر تقریب کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ :۔

یہ سب ترقی کے ابتدائی دور میں ہیں۔ اور یہ کہ ان گھروں سے بھی اکثر مہنگائی کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ اور اپنی حکومت پہ یہ عوام نا اہلیت اور اقربا پروری کے الزام عاید کرتے رہتے ہیں۔

آج کی لڑکی اتنی کیوں بگڑتی جا رہی ہے۔ تاجی آپا کئی بار بڑے دکھ سے سوچا کرتی۔

وہ اپنے ہاں اماں کا ایک مونگیا رنگ کی شنیل کا سوٹ تھا۔۔۔ ہم اُسے کبھی کبھی نکال کر دیکھتے تھے ہمارے دنوں میں تو ایک قیمتی کپڑا صرف بری اور جہیز

یں رکھنے کو ہوتا۔ مگر آج کی کنواریوں نے تو اپنے
لباس میں بری اور جہیز کا قصہ ہی ختم کردیا ہے۔

اور سعدیہ کے گھر سے اس کی مایوس کن باتیں سن کر باصرہ نے اندھیرے میں چپ چاپ لیٹے لیٹے سوچا تھا۔

کاش جبار تم جان سکتے۔ آج کی لڑکی کو بگاڑنے میں خود تمہارا بھی کتنا ہاتھ ہے.... بلکہ سچ پوچھو تو میرا فلموں، ٹیوشنوں کی طرف بڑھتا قدم:۔

یہ بھی تیرے عشق کے صدقے
یہ بھی تیرے غم کے بہانے

کہ جب تم اور تمہاری ماں مجھے قدامت پسندی کا طعنہ دے کر چلے آئے تھے۔ تو میں نے تسلیم کرلیا تھا۔ کیوں کہ اس وقت میں ایسے گھر کے اندر اپنی کوٹھڑیا میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جس کے باہر برآمدے کے ماتھے پہ پرانی چقوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ اور برآمدے کے آگے بڑھے ہوئے چھجے پہ مدتوں کا کوڑا کرکٹ، ٹوٹے ہوئے برتن بالوں کے گچھے، روئی کے پھاہے، پھلوں کے چھلکے، آم کی گٹھلیاں، خربوزوں کے بیج گر کر جم چکے تھے۔ جن میں کہیں کہیں کونپلیں اور پیپل کی ٹہنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ جب ہمارے گھر میں ڈرائنگ روم نہیں ہوتا تھا۔ ہماری بیٹھک میں سرکنڈوں کے مونڈھے ہوتے تھے۔ نماز والی چوکی پہ دھرے گاؤ تکیے اور پلنگ پہ بھی دوسوتی کی چادریں بڑے بڑے مور کڑھے ہوئے تھے۔ موروں کا رنگ سرخ، زرد اور سبز تھا۔ انگیٹھی پہ پرانے آئے ہوئے عزیزوں، سہیلیوں کے عید کارڈوں سے مٹی کے پھول دان

تک سجائے ہوئے تھے۔ دیوار پر مور کے پنکھوں سے بنائے ہوئے پنکھے آویزاں تھے۔

مگر شہر آکر پتہ لگا۔ اگر بیٹھک کو ڈرائینگ روم کا نام دے دیں۔ اور سرکنڈوں کے مونڈھوں پر شیشے کے کام کے کشن رکھ دیئے جائیں تو ہم لوگ بڑے موڈرن کہلا سکتے ہیں۔

چناں چہ میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ جدید زندگی کی طرف یہ میرا پہلا قدم تھا۔

میں نے تم سے انتقام لینے کا ہرگز نہ سوچا تھا۔ میں نے کسی اور کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ تمہیں بھول جانے کے خیال سے میں نے سعدیہ کا کہا مانا تھا۔ میں نے بھی ٹیوشنیں پڑھائی تھیں۔ فلمیں دیکھی تھیں میں جوں جوں آگے بڑھتی گئی مجھے احساس ہوتا گیا۔ کہ یہاں اکیلی میں اور سعدیہ ہی نہیں۔ ہر گھر میں ایک دو لڑکیاں اسی طرح بیٹھی ہیں۔ اسی طرح مسائل میں الجھتی ہیں۔

وہ سب جو اپنے گھروں کو ترسی ہوئی ہیں۔ جو اپنا جیون ساتھی پانے کی جدوجہد میں ناکام ہو چکی ہیں۔ اب اپنی محرومیوں کو پاٹنے کے لیے اپنا سارا دھیان فیشن کی طرف موڑ دیتی ہیں۔ یہی حال میرا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو موسٹ ماڈرن بننے پر تیار کر لیا ۔۔۔ ذرا تم خود دیکھو جبار!۔

ہمارے سکول کی کونسی تقریب ہے۔ جس کی تصویر اخبار میں نہ چھپی ہو۔ اور میں اس میں موجود نہیں۔

میں دوپٹے کو کمر کے گرد باندھ کر بچوں کے ساتھ کھیلوں میں

شریک ہوں۔

میں ساٹن کی آڑی ٹوپی پہن کر بچوں کے ساتھ قوالی کر رہی ہوں
میں پک نک کے موقع پر بچیوں کو آگ سلگانے کا طریقہ سمجھا رہی ہوں۔

میں گائیڈ ہاؤس میں کیمپنگ (Camping) کا مظاہرہ کر رہی ہوں۔

میں سول ڈیفنس کے مظاہرے میں جلتے مکان سے چھلانگ لگا رہی ہوں۔

میں فسٹ ایڈ کی کارکردگی دکھانے کو مریضوں کی مرہم پٹی کر رہی ہوں۔

میں سٹیج پر مائیک سنبھالے کھڑی صدر کو انعام پانے والی طالبات کے نام پیش کر رہی ہوں۔

غرض — جدھر دیکھتی ہوں۔ ادھر میں ہی میں ہوں —

یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ آج اتنے برس بعد بھی دل کا ایک کونہ خالی ہے۔ کہ جسے بھرنے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس نے اپنی جملہ پسندیدگی کے بعد معاملہ اپنی ماں کے سپرد کر دیا تھا۔ اور سعدی نے آج بتایا ہے۔ کہ اس کی ماں کہتی ہے۔

لڑکی! استانی ہے۔ خیر نوکری کرنا تو برا نہیں۔ آج کے زمانے میں دونوں کمائیں تو گھر بنتے ہیں۔ مگر یہ لڑکی تو خاصی تیز ہے۔ ہر کام میں آگے آگے۔ ہمیں

اتنی تیز - ایسی چنڈال لڑکی نہیں چاہیے - یہ گھر کیسے
سنبھالے گی ۔۔۔ میں کہتی ہوں، لڑکی ایسی تو ہو کہ
اپنے خاوند کو روٹی تو پکا کر کھلا سکے -

اور میں سوچ رہی ہوں - کاش تمہاری اور وحیدہ کی ماں اکٹھی
مل بیٹھیں - تو میں ان دونوں سے پوچھوں -

میری قسمت کا فیصلہ سنانے والیو! تم مجھے کیا
بتانا چاہتی ہو ــــ
تم میری امنگوں کی لاش کو کب تک یونہی بے گورو
کفن گھسیٹتے رہو گے ؟
میں کب تک منزل کی تلاش میں سُرایوں میں بھٹکتی
رہوں گی -
اور یہ دور کب تک صرف لڑکیوں کو الزام دے گا -

اور ہم ایسی لڑکیوں کی ساری کارکردگی کی داد رنڈوے
شوہروں کے بچے پالنے ہی میں مل سکتی ہے - اور کچھ نہیں -
سوائے دل جلا دینے والے طعنوں کے -
تمہیں کسی میں تعلیم کی کمی لگتی ہے -
کسی میں جہیز کی -
اور کسی میں ماحول کی -

مگر میں تو آج سوچ کے اس فیصلے پر آن ٹھہری ہوں - کہ وہ لڑکیاں
ٹھیک کرتی ہیں - جو تمہاری باتیں ماننے کی بجائے تمہارے وقار
اور اپنی عزت کا سودا کرتی ہیں -

کہ تم لوگ۔ سب اپنی بنیادوں اپنی جڑوں سے ہلے ہوئے ڈانواں ڈول جسم ہو۔ جو ان کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے ہو۔

اور ہم ہی نقائص نکالتے ہو۔ میرے خدا۔ یہاں اب کونسا معاشرہ تعمیر پائے گا۔

ہم کہاں جائیں گے۔؟

کیا ہماری گودیں اپنوں بچوں کو اسی طرح ترستی رہیں گی۔

اور —— .. اور ——

آنے والا دور کس قدر بھیانک ہو گا۔

مگر کون زندہ رہے گا۔

آنے والے کل کو کون دیکھے گا ——

کون —— ؟

کون —— ؟

وہ سنا ہے۔ ہمارے شہیدوں کی بیگمات اب بڑی سوشل ہوئی جا رہی ہیں۔ قوم نے انہیں ہاتھوں ہاتھ کیا لیا ہے۔ اب تو وہ سوشل طبقے پر چھاتی جا رہی ہیں۔

اچھا ہے یار ـــــ پہلے تو مٹھی بھر بیگمات تھیں۔ انہیں گائیڈڈ ہاؤس سے یوتھ موومنٹ کے جلسوں تک دیکھ دیکھ کر طبیعت اُوب گئی تھی۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنی ایک کزن کا لطیفہ یاد آتا ہے۔ وہ اپنے میاں کے ساتھ باہر کے دو ملکوں میں گئی۔ اس کا میاں سیکرٹری تھا۔ میں نے اسے ایک دن کہا۔

تمہارے تو بہت مزے ہوں گے وہاں۔

کہنے لگی، توبہ کرو ـــــ اتنا محدود حلقہ ہوتا ہے۔ کہ بس ہر فنکشن میں بس ساڑھی اور زیور بدلا جاتا ہے۔ ایک ہی چہرے دیکھ دیکھ کر مجھے متلی ہونے لگتی تھی۔ اس لیے میں تو جلد سے جلد پاکستان آنا چاہتی تھی۔ تو یہی حال ان بیگمات کا ہے۔

مگر یار۔ یہ قابل احترام بیگمات کسی کان نمک میں جا کر نمک نہ بن جائیں۔

مجھے تو اس بات کا ڈر ہے۔ کہ آنے والے الیکشن میں اگر کوئی بیوہ اپنے شہید کے خون کے عوض عوام کا ووٹ مانگنے نکل آئی

تو۔ —

ایسا ضرور ہوگا۔

تو پھر شہیدوں کا امیج بگڑ جائے گا۔

ابھی تو گاؤں گاؤں ستمبر کی یادیں جلسے ہونے ہیں۔ عزیز بھٹی کی قبر پہ باقاعدہ میلے کا سماں ہوتا ہے۔ اور ادیب و شاعر تو جلوس کی شکل میں بری سے چونڈہ تک گم نام شہید کی قبر پہ پھول چڑھاتے ہیں۔

ویسے مجھے تو صادقین کا وہ شاہکار پسند آیا۔ جس نے چھ ستمبر کو "ستم بر" بنا کے بھارتی جرنیل کو دکھایا تھا۔

چھ ستمبر کے ترانے غضب کے تھے۔ اب تو پھر خرافات بڑھ گئی ہے۔ ہر جگہ....

سنا ہے۔ صدر یحیٰی کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس نے اسے ملک کے باہر بھیج دیا ہے۔

اسے اپنے سے پہلے صدر کے بیٹوں کا حشر سامنے ہے نا۔

مگر یہ — یحیٰی۔ عورت باز ہے۔ بہت سخت۔

کیا مطلب — لڑکیوں نے اپنا رخ ایر ہوسٹس ریحانہ کی طرف موڑ لیا۔

ارے تم تو اس دن فلائٹ لے کر گئی تھیں۔ یہ کہہ کر کل واپس آجاؤں گی۔ اور اب چلی آرہی ہے بنو۔

اس لیے کہ آپ کے صدر کی فرمائش پوری کر رہی تھی۔

یعنی —

کیا۔

فرمائش ۔

ہاں ۔ سنو تو ۔ تم تو دیکھتی ہی ہو ۔ میں غیر ملکی فلائٹ کے کریو میں بھی جاتی ہوں ۔ تم سب لڑکیوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ فیشن ایبل سمجھتی ہوں ۔ مگر جونہی اس صدر کے ساتھ کراچی پہنچی ۔ تو میری فائل منگوائی گئی ۔

اور میرے متعلق لکھا گیا ۔

بھورے بال' بھورے رنگ کی آنکھوں پر
سیاہ میک اپ ۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں
ہونا چاہیئے ۔

اب میرے عملہ کو مصیبت آگئی ۔ کہ واپسی پر صدر کی فلائٹ کے ساتھ مجھے ہی آنا تھا ۔ اور عملہ نے میک اپ بدل کر اپنی کار کردگی بھی شو کرنی تھی ۔ تب مجھے جہاز سے سیدھا ایک کار میں انفنسٹن سٹریٹ لے جایا گیا ۔ میرے لیے میک اپ تلاش کرنے الغی کی مصیبت ہے ۔ بڑی دکانیں جلد بند ہو جاتی ہیں ۔

صبح تک انتظار کون کرتا ۔ اتنے میں ایک سٹاف ممبر نے بتایا کہ ان کے ایک دوست کی بیوی جرمن ہے ۔ اور میرا رنگ وغیرہ ان سے ملتا ہے ۔ چلو اس سے میک اپ میں بدل جائے ۔۔۔ چنانچہ وہاں ڈیفنس میں جا کر انہیں سوتے سے جگایا ۔ ۔ اس سے میک اپ کا سامان لے کر چہرہ سجایا ۔

دوسرے دن پھر اس کے پاس گئی ۔ بھاری قیمت دے کر وہ سامان خریدا ۔۔ تاکہ واپسی پر ہمارے نازک مزاج رنگیلا راجہ

کو مکمل سکون اور ذہنی آسودگی میسر آسکے ۔ ۔ ۔ ۔

کاش ہمارے سربراہ مملکت عوام کی ضروریات کے لیے بھی اتنے ہی نازک مزاج بن سکیں۔

یہ تو عوام کو کیا پاکستان کو لے ڈوبے گا۔ سنا ہے تمام دن شراب میں مست رہتا ہے۔

ہاں سفر کے دوران بھی شغل جاری رہا۔

سنا ہے۔ بڑی بڑی بیگمات اسے پلانے میں پیش پیش ہوتی ہیں۔ باقاعدہ عیاشی کی رنگین محفلیں برپا رہتی ہیں۔

کیا خیال ہے۔ کہ مسٹر بھٹو عوام کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہاں۔ وہ نعرے تو بہت مار رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو عوام کا دوست ظاہر کرنے میں اب عوامی لباس میں نظر آرہے ہیں۔

سب کرسی سے اترے ہوئے ایسا ہی کرتے ہیں۔

مگر یہ تو اپنے تھیلے میں اعلان تاشقند کی بلی لیے پھر رہا ہے۔ وہ بتائے گا۔ اور ضرور بتائے گا ۔ سنتے ہیں کہ اعلانِ تاشقند کے موقع پر ایوب نے ساٹھ لاکھ کا سونا لیا تھا۔

نہیں اپنے بیٹے کو سوئٹزرلینڈ میں بزنس دلوائی تھی۔

سب بکواس ہے۔ بھئی۔ بس بڑی طاقتوں نے اس سے کچھ منوانا تھا۔ منوالیا۔ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ سب عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جارہی ہے۔

ہاں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ پہلے بڑے لوگ اونچی سطح پہ بیٹھ کر

عوام کا استحصال کرتے رہے ہیں۔ اور اب خود عوام کے عوامی نمائندے عوام کا استحصال کرنے کو تیار ہو رہے ہیں۔

مگر یہ یکینی فوجی حکومت سے دست بردار کیوں نہیں ہوتا۔

مگر یاد رکھو۔ جس دن فوج ان کرسیوں سے ہٹی۔ عوام کا کچومر نکل جائے گا۔

مارشل لار تو وہ ۱۹۵۸ء والا تھا۔ اللہ۔ دکان داروں نے کپڑا دو روپے گز تک بیچ دیا تھا۔ دہی دودھ کی دکانوں پر جالیاں لگ گئی تھیں۔

اس بار فوجی حکومت اتنی سخت نہیں۔

ہمیں دکھ ہے۔ کہ فوج کو سول کی ڈیوٹیاں دے کر اس کا وقار ختم کیا جا رہا ہے۔

مگر قوم بیدار ہو چکی ہے۔ وہ ہر فرد کو اس کا جائز مقام دلا کر رہے گی۔

سنا ہے۔ نئی پارٹی کی خواتین شاخ نے بھی جنم لیا ہے۔ وہ سفید بالوں والی سوشل ورکر ہوتی تھی ناں۔ کیا نام ہے۔ جنہیں دعوے ہے۔ کہ ماضی میں انہوں نے مسلم لیگ کے لیے بہت کام کیا ہے۔ اور اب آمریت کے دور میں وہ اپنے عوام کے لیے پریشان رہتی ہیں۔ کیا نام ہے اُن کا ―

وہ بیگم آباد احمد ―

ہاں۔ ہاں۔ پارٹی کی وہ بنیادی ممبر بھی ہیں۔ کہتی تھیں کہ مسلم لیگ کی زنانہ شاخ کے زمانے میں بھی وہ چار آنہ ممبر شپ پر مسلم لیگ کی ممبر

بنی تھیں۔ اور اس کے لیے بہت زیادہ محنت کرنا پڑی تھی۔ کئی جگہوں کے زنانہ جلسوں میں تو عورتوں نے اپلوں پر کھیس بچھا بچھا کر جلسہ گاہ بنائی تھی۔ اس لیے اب بھی عوام کی قوت سے ہوگا۔ جو بھی ہوگا۔۔۔۔

ویسے اس وقت ان کے ساتھ تین چار بیگمات ہیں۔ بیگم خاکوانی۔ بیگم راجہ۔ باقی تو سب اپنی اپنی کوارٹروں والی ساتھ ہوتی ہیں۔

وہ پروین لطیف اور مسرت شاہین بھی تو ہوتی ہیں ساتھ۔

ہاں۔۔۔ اب تو عورتوں کی اکثریت شامل ہو رہی ہے۔ آج کی عورت خاصی بیدار ہو چکی ہے ناں۔

بیداری کا کیا پوچھتے ہو۔ وہ تم آسیہ کو جانتی ہو۔ جو یہاں ہوسٹل میں رہا کرتی تھی۔

ہاں۔ وہ پیاری شکل کی لڑکی۔ جس کے ہر کرتے پہ دوپٹے پر کڑھت ہوتی تھی۔ وہ غالباً ریاست بہاول پور کی تھی۔

ہاں۔ بہاول نگر کی۔

ہاں اُسے کیا ہوا ہے۔ یہاں سے تو آپا نے اسے چلتا کر دیا تھا۔ جب اس کے روز روز کے بہانے سُنے۔

سنا ہے۔ اس نے اسی لڑکے سے شادی کر لی ہے۔ سیاہ فام سے جو اسے لیے پھرتا تھا۔

لڑکا۔ ارے بھئی وہ تو چار بچوں کا باپ ہے۔

تو اس نے اسے اپنے کاروبار کا مہرہ بنایا ہوگا۔

خیر آسیہ ہے واقعی پر اسرار ہستی۔

نفسیاتی کیس تھی۔

وہ جب یہاں سے نکالی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک دن اخبار کی رپورٹر اس کا پتہ پوچھتی آئی تھی۔ وہ تو اپنے اخبار میں عورتوں کے صفحے پر اس کی تصویر اور غزل چھاپ کر مصیبت میں پڑ گئی تھی۔ ہر روز اُسے مردوں کے خط چلے آتے تھے۔ ہر ایک نے اس کا الگ نام لکھا تھا۔ اور پوچھا تھا۔

آپ نے تصویر تلے غلط نام کیوں لکھا ہے۔

اور یہ بتائیے۔ یہ لڑکی آج کل کہاں ہے؛

سیالکوٹ سے ملک اکرم نے لکھا تھا:۔

ایک شب میں لیٹ شو دیکھ کر آ رہا تھا۔ کہ چھاؤنی کے راستے میں ایک اکیلی لڑکی مجھے نظر آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی سوتیلی والدہ نے اس کا سودا کسی بوڑھے آدمی سے کر دیا ہے۔ اب وہ اپنی سگی ننھیال میں جانا چاہتی ہے ۔۔۔ میں ہوٹل میں اُسے ساتھ لے گیا۔ وہ دو دن میرے ساتھ میرے کمرے میں رہی۔ پھر میں اسے گجرات لے گیا۔ اپنے عزیزوں میں وہ مجھے ساتھ نہ لے گئی۔ مگر مجھے خط لکھنے۔ دوبارہ ملنے کا وعدہ بار بار کرتی تھی۔

اس لڑکی کا نام نسیم کوثر اعوان تھا

آپ نے آسیہ ملک کیوں لکھا ہے اس کا نام۔

راولپنڈی سے ایک مرد نے لکھا تھا:۔

غزل تو ہمیں نہیں معلوم۔ مگر یہ کہ شاعرہ کی تصویر پر

نام غلط ہے - اس تصویر کو میں جانتا ہوں - یہ شیریں ملک کی ہے - شاید آج کل ایم - اے کر رہی ہے - یہ گذشتہ دنوں مری میں اپنے گروپ کے ساتھ آئی ہوئی تھی - ایک ہفتہ کے لیے - مگر اپنے ایک کالے کلوٹے کزن سے نالاں تھی - جو یہاں بھی آ پہنچا تھا وہ اس سے چھپتی چھپاتی اپنے گروپ سے ہٹ کر ہمارے ساتھ آ ملی تھی - اسے ہمارا ایک دوست ہمارے کمرے میں لایا تھا - ہمارے دوستوں کو میرے سمیت اس کے سارے خد و خال سارے خطوط ازبر ہیں - پھر اس شکل پہ نام غلط - ہم کیسے برداشت کرلیں -

ایک خط لاہور ہی سے تھا - اس نے اس کا موجودہ ایڈریس مانگا تھا - کہ یہ غزل وہ اس سے لکھوا کر لائی تھیں - اور پھر اپنے نام سے چھپوا دی -

اسی طرح کے اور خط بھی وہ لائی تھی -

سنا ہے - آسیہ کی ماں اچھی عورت نہ تھی - اس کا باپ ضرورت سے زیادہ شریف تھا - مگر یہاں آتے ہی آسیہ ایسے گروپ کے ہتھے چڑھ گئی تھی - جو بڑے لوگوں کو سفارش کے طور لڑکی رشوت میں دیتے ہیں -

وہ شاہ جہان بھی تو یہی کچھ کرتی تھی - وہ بھی تو ہمارے ہوسٹل میں آئی تھی -

بڑی چالاک تھی۔ اس نے آتے ہی اپنے عزیزوں کی فہرست میں ایس۔پی۔ تھانے دار۔ انفارمیشن آفیسر وغیرہ کے نام دیئے تھے۔ اور پھر اُن کے ساتھ مزے سے چلی جاتی تھی۔

یہ بڑے لوگ اتنے حیوان کیوں ہوتے ہیں۔

نہیں یہ سب نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ یہ عورت کو اپنے سامنے بے ستر کرکے اپنے اس کمینے جذبے کو تسکین دینا چاہتے ہیں۔ جس کے تحت وہ یہ سب کچھ ماننے کو تیار نہیں۔ کہ عورت کا جسم پاک اور مقدس ہے۔

مگر عورت غیرت والی ہو تو انہیں منہ پہ جوتی مارے۔ وہ یاد ہے۔ نیلو نے جب خودکشی کی کوشش کی تھی۔ مگر دربار میں ناچنے نہ گئی تھی۔

مگر ہر عورت نیلو نہیں ہوتی۔

مگر ہر مرد میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے۔ وہ جب دوستوں میں شیخی مارتا ہے۔ تو اس میں عورت کا وجود ضرور ہوتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے۔ میں نے سکول سے استعفیٰ دیا تھا۔ رابعہ بول رہی تھی۔

مجھے سکول گئے چند روز ہوئے تھے۔ کہ میں رجسٹر پہ سائن کروانے دفتر میں گئی۔ میرے پرنسپل خود بہت شریف ہیں۔ مگر دوست کو فون کرتے ہوئے کہنے لگے۔

یار آؤ ناں کبھی۔ اب تو میرے ہاں۔ بڑی سمارٹ استانیاں آئی ہیں۔ بالکل نئی — چلو۔

ایک پیالی چائے ہی پی لو - ان کے ساتھ ...
تم بھی کیا یاد کرو گے ـــ"
مجھے فون سن کر یوں لگا - جیسے میں قدیم زمانے کی کنیز ہوں -
اور میرا آقا سر عام میری نیلامی کر رہا ہے - میں دفتر سے واپس آئی
تو میں نے دیگر سٹاف ممبرز سے پوچھا -
کہ یہاں کیا پرنسپل کے دوست آتے ہیں کبھی -
معلوم ہوا - یہاں کے فنکشن ہوں تو دوست آتے ہیں - یوں بھی
کبھی کبھار منڈلی لگا بیٹھتا ہے - اور اپنی استانیوں کا تعارف
ضرور دوستوں سے کرواتا ہے - چناں چہ میں نے اسی وقت استعفیٰ
لکھا - اور انہیں پیش کر دیا - اور پھر اسی سکول میں جگہ حاصل کی -
جہاں مرد پرنسپل نہ ہو ـــ
اے ہے - عورتیں کوئی کم ہیں - وہ نہیں ماڈرن سکول والی -
وہ نویں دسویں میں ہمیشہ وہ لڑکیاں لیتی تھیں - ٹڈل اور میٹرک
انہیں ایک سال میں میٹرک پاس کروانے کی گارنٹی تو دیتی ہے - مگر
ساتھ ساتھ انہیں جانے کہاں کہاں کی گارنٹیاں دلوا دیتی ہے -
اللہ رحم کرے -
یار ویسے دیکھا جائے تو عورت ہے بڑی ظالم چیز - کہ مرد
ظلم کرتا ہے تو عورت پر - اپنی صنف پر نہیں - مگر عورت ہمیشہ عورت
پر ظلم کرتی ہے - اور اسے اپنا فرض اور حق سمجھتی ہے -
اب عورت جوں جوں ترقی کی منازل طے کرتی چلی آ رہی ہے -
اس کے دکھ اور ظلم بھی بڑھتے چلے آ رہے ہیں - اب یہاں کی عورتیں

بہت خوش ہو گئی تھیں - عائلی قوانین پا کر - مگر بتاؤ - یہاں کی عورت کو کیا ملا ــــ ؟ وہ پہلے سے بھی زیادہ بے دست و پا ہو گئی - پہلے سے زیادہ مظلوم ہے -

عورت نے کیا ہی کیا ہے - ابھی تک جنرل سیٹ سے تو الیکشن بھی نہیں لڑ سکتی - انہیں مرد ممبر نہ چنتے ہیں - اور ظاہر ہے - یہ وہاں کہاں خواتین کے حقوق پہ بول سکتی ہیں - ابھی تک عورت اسمبلی میں اپنی نمائندگی کے طریقے کو تو بدل نہیں سکی - خود کہاں بدلی جائے گی -

مگر عورت تو بہت بدل گئی ہے . . . دیکھتی نہیں ہو - جلوس تک تو نکالنے لگی ہے . . . .

ہاں ــــ عورت بدل گئی ہے - تاجی آپا نے کامن روم سے آنے والی آوازوں کے جواب میں سوچا ــــ آج تو وہ صبح سے ہی عورت کی تبدیلی کے بارے میں سوچ رہی تھی - وہ آج ایک نئے تذبذب میں مبتلا تھیں - کہ صبح دس لڑکیوں کے دستخطوں سے ایک درخواست موصول ہوئی تھی - انہوں نے لکھا تھا :-

محترمہ !

ہمیں آپ کے پاس رہتے عرصہ ہو گیا ہے - مگر ان دنوں ہم عجیب مصیبت میں گرفتار ہیں - کامن روم میں افشاں خق، ناصیہ بخاری، لبنیٰ ثاقب، فضیلت اقتدار اور ریحانہ واسطی بے تحاشا سگریٹ پیتی ہیں - انہیں جب ہم نے ٹوکا - تو جواب ملا -

تمہارے باپ بھائی نہیں - کیا وہ سگریٹ نہیں

پیتے - بنو عادت ڈال لو۔ اس سگریٹ کی بو کی۔ ورنہ کل کلاں کو خاوند کے سگریٹ سے دماغ چکرایا تو اپنا پلنگ کہاں گھسیٹتی پھرو گی۔ اور اس زمانے میں جب والدین جہیز میں ڈبل بیڈ دیتے ہیں - ہاں -

اس لیے مہربانی فرما کر ہماری درخواست پہ جلد سے جلد نوٹس لیا جائے۔ ورنہ ہم مجبوراً یہ سمجھنے پہ حق بجانب ہوں گی - کہ آپ کا ہوسٹل بھی دیگر پرائیویٹ ہوسٹلز سے مختلف نہیں ہے۔ اور پھر کہیں بھی رہا جا سکتا ہے —

جب باجی نے انہیں بلا کر سمجھایا کہ سگریٹ پینا ہی ہے۔ تو غسل خانے میں جا کر پی لیا کرو - تو جواب ملا -

ہم ذہنی سکون کے لیے پیتے ہیں۔ غسل خانہ میں جا کر تو طبیعت اور بھی خراب ہوتی ہے۔ وہاں سگریٹ کیسے پیا جائے۔

تو پھر اپنے کمرے میں بند ہو کر پیا کرو۔ تاکہ —

دیکھیے باجی — سگریٹ تو پیتی ہی اس وقت ہیں جب کامن روم میں زوردار بحث ہو رہی ہو۔ ذری پر لیٹ کر ٹانگیں صوفے پر رکھ کر آڑا آڑا لیٹ کر . . واہ کیا مزا آتا ہے۔ اپنے کمرے میں اکیلے بند ہو کر سگریٹ پینا احساس دلاتا ہے کہ ہم مجرم ہیں۔

اے - وہ ہماری کالج کینٹین والا اچھا تھا۔ ڈرنک ٹنک لا دیتا تھا۔ ہم نے سموسوں کا آرڈر دینا کمرے کے لیے۔ اور وہ مزے سے سیون اپ کی بوتل میں . . . .

ناہید۔۔۔۔ باجی زور سے چیخ دیں۔ مگر پھر خود ہی کمرے سے باہر آگئیں۔ ناہید نے باجی کی حالت پر قہقہہ لگایا۔ اور پھر ہنس کر اقتدار سے بولی ۔۔۔ باجی کو تو ڈرنک کا نام ہی سن کر نشہ آگیا۔ اگر دو گھونٹ و۔س۔ک۔ی کے پی لیں۔ تو پھر ۔۔۔ ان سب مولوی ٹائپ لڑکیوں کی دھمکی کی پروا نہ کریں۔ اور انہیں د۔ف۔ع کر دیں۔

اب انسان اپنی فرسٹیشن کو کم کرنے کے لیے فلرٹیشن کے چانس کھو دے۔ تو کیا سگریٹ پی کر ذرا سکون بھی نہ پائے ۔۔۔ حد ہو گئی ۔۔۔ ۔۔۔ ہوں۔

میرے خدا ۔۔۔ یہ آج کی اولاد۔ روایات توڑتی ہے۔ تو اتنے گستاخ لہجے میں ۔۔۔ ہا ۔۔۔ یہاں مقبول ہوتی تھی۔ جو رات گئے تک تسبیح کیا کرتی تھی۔ اور برقع یوں لپیٹ کر اوڑھتی۔ اور اوڑھے ہی رہتی ۔۔۔ اس کی شادی جب اس کے اپنے ہی محکمہ کے ایک ساتھی سے طے پائی۔ تو سب اسے چھیڑا کرتی تھیں۔ کہ اس نے تم سے شادی کی درخواست محض اس لیے دی ہے۔ کہ تمہارا برقع تو اتار کر دیکھوں اندر تم ہو۔ بھی، یا نہیں۔ کہ تم برقع ہو۔ یا برقع تمہارا وجود ہے۔

اور گلشن تھی۔ جو کسی عقیدت سے کونڈوں کا ختم دلایا کرتی تھی۔ کونڈوں کا قصہ سننے کے لیے چند لڑکیاں بڑی عقیدت سے سر نیوڑائے بیٹھی ہوتیں۔ اور پھر اس کی نیاز والے کونڈے تلے اپنی منت کے پیسے رکھ دیتیں۔

اسی کامن روم میں تابندہ اکثر اپنی مشکلات پر حضرت علی کا روزہ یا بی بی فاطمۃ الزہرا کا معجزہ مانا کرتی - پھر کسی کو سنے میں بیٹھی کسی لڑکی کو قصہ سناتی پائی جاتی - چنے — یا مٹھائی بانٹتی پھرتی -

محرم میں تو یہاں جب زلیخا بخاری بڑے موڈ میں ہوتی - تو سوز خوانی بھی کرتی تھی - اور ساری شیعہ سنی لڑکیاں سوگوار سی بیٹھی ہوتیں - ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرا کرتے -

مگر زمانہ کتنا آگے بڑھا ہے - اور کہاں جا پہنچا ہے - میں یہاں کس کس کا نقش پا تلاش کروں - اور ان سانچوں میں اب یہاں کس کو فٹ کروں - میرے — خدا — میں انہیں کیسے سمجھاؤں - کہ سکون کی تلاش میں ہم بھی منتشر ہوئے تھے — پرابلمز نے ہمیں بھی تھکا دیا تھا - فرسٹیشن نے تو کئی بار ہمارے چہرے پر بھی قبضہ کرنا چاہا تھا رگوں اور پٹھوں کے تناؤ نے تو ہمیں بھی سر درد کا دورہ تحفے میں دیا تھا -

مگر ہم تو تازہ دم ہونے کے لیے بڑے عجز سے وضو کرتے - پورے خلوص سے نماز پڑھتے - اور پھر سجدے میں سر رکھ دیتے - اٹھتے تو قرآن مجید کی تلاوت کرتے — ہاں یہ پہاڑ ایسی زندگی اور پُر خطر گھاٹیوں کے اندھے موڑ یونہی تو نہیں کٹ گئے - ہم خدا کا سہارا لے کر چلتے تھے - اور یہ سگریٹ کو وجہ سکون بنائے ہوئے ہیں — ڈرنک میں ذہنی اور قلبی اطمینان تلاش کرتی ہیں - حالانکہ یہ چیزیں سکون دیتی نہیں - سکون کے لوازمات کی تلاش میں سرگرداں کرتی ہیں -

ہا۔ پینسٹھ کی جنگ میں یہاں سب لڑکیاں مل کر آیت کریمہ کا ورد کرتی تھیں۔ بلیک اوٹ میں موم بتیاں جلا کر اندھیرے اندھیرے کمرے میں یہ سب لڑکیاں کتنی مقدس لگتی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پہ سوتے جاگتے نصر من اللہ و فتح قریب کا ورد ہوتا تھا۔ جنگ کے بعد کی خلوص و عجز سے انہوں نے میلاد کی محفل سجائی تھی۔ اور رہس طوسی نے آنسوؤں سے رو رو کر دعا کی تھی۔

مگر اب تو حالات کیسے بدلتے جا رہے ہیں۔ ہر لڑکی بدل کر رہ گئی ہے۔ اسی نغمہ ہی کو لو۔ جس کا نام باپ نے بڑی عقیدت سے بتول رکھا تھا۔ مگر یہ اپنے ہی باپ کے تقدس سے نالاں ہے۔

لاہور آتے ہی اس نے باپ کا دیا ہوا نام بدل دیا تھا۔ جیسے اپنے باپ سے محض اس لیے نفرت ہے۔ کہ وہ تمام دن حدیثیں پڑھتے نعتیں لکھتے گذار دیتے ہیں۔ جو ان سب بہنوں کو برقع اوڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور کالج کی تعلیم کیا ہوا بھی نہیں لگوانا چاہتے۔ بس لڑکی کو میٹرک تک پڑھایا۔ اور پھر خاندان ہی کے کسی کلرک پیشہ لڑکے سے شادی کر دیتے ہیں ۔۔۔ ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔

اور وہ نئی زندگی اپنانے کے لیے گھر چھوڑ کر یہاں آئی تھی۔ پہلے دن اس نے بے حد کھلے کھلے پائنچوں کی (کہ ان دنوں کھلے پائنچوں کا قطعی رواج نہ تھا) کی شلوار پہن رکھی تھی۔ اور ریٹھے کے سات گز کے سفید برقع میں لپٹی ہوئی تھی۔ مگر دفتر جاتے ہوئے دوپٹہ لے کر گئی۔ دوسرے اتوار میری مشین پر شلواروں کے پائنچے تنگ کیے اور قمیضوں کو بلیٹ ڈالے۔ وہ آئی تو معاشرتی بہبود میں تھی۔ کام کرنے کو مگر بعد میں

اپنے نام کی طرح محکمہ بھی بدل لیا۔ ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کی۔ اب بغیر آستین کی قمیض، بیل باٹم پہنتی اور رچنا ہوا دوپٹہ کندھوں پہ ڈالنا پسند کرتی ہے۔ راہ چلتی ہوئی سیٹی بجاتی ہے۔ اپنا خاندان چھپا کر اپنی شخصیت ظاہر کرتی ہے۔ اونچی جگہ رشتہ کرنا چاہتی ہے۔ رشتہ کھوجتے کھوجتے تین چار مردوں سے دوستی کر چکی ہے۔ مگر معاملہ کبھی نکاح تک نہیں پہنچا۔

ایک دن اس کی ماں سمجھانے آئی۔ تو اُسے بے طرح دھتکار دیا تھا:-

اے ماں۔ تو یہاں کیا کرنے آئی ہے۔ کیا تیرا جی کرتا ہے۔ میں بھی تیری طرح ہر سال بچہ جنتی رہوں اور کسی مولوی شوہر کے مسائل یا کلرک خاوند کی شیخیاں سنتی رہوں۔

ماں۔ مجھے معلوم ہے۔ تجھے میرا باپ کبھی بھی پسند نہیں آیا۔ اس لیے میں صاف صاف کہتی ہوں۔ کہ ہم سب حرامی ہیں۔ سب بہن بھائی۔ اب مجھے اپنے نقش قدم پہ چلنے پر مجبور نہ کر — ہاں —"

لڑکیاں اس کی اس درجہ بدزبانی پہ چیخ اٹھی تھیں۔ ماں رو رو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اُسے میں نے ہوش دلا کر چائے پلائی تھی۔ مگر اس کے آنسو اس کی سانولی چھائیوں بھری گالوں پہ پھسلتے ہی چلے جا رہے تھے۔

وہ روئے جا رہی تھی۔ اور ڈھیر سے ڈھیر سے جیسے اپنے

آپ کو سنا رہی تھی۔

اس کا باپ ٹھیک کہتا تھا۔ اسے مت پڑھا۔ لڑکی آزاد ہو جائے گی۔ مجھے اس کی عادات اچھی نہیں لگتی۔ یہ بڑی آزادی پسند ہے۔ فیشن چاہتی ہے مگر میں نے چوری چھپے اسے پڑھایا۔ پرائیویٹ پڑھتی تھی۔ محلے میں سکول تھا۔ وہاں ساتھ ساتھ پڑھاتی تھی۔ یہ کمینی باپ کے ایک دوست کو دل دے بیٹھی۔ باپ کو غصہ آیا۔ اور یہ اپنی تنخواہ لے کر خالہ کے گھر جانے کا بہانہ کر کے لاہور چلی آئی۔ اب ہمیں پہچانتی ہی نہیں۔ نہ کبھی خط نہ سلام . . . ایک دن پچھتائے گی۔ مجھے بڑھاپے میں طلاق دلوائے گی۔ کمینی ـــ

ماں کے چلے جانے کے بعد نغمہ نے بتایا . . .

اماں تو بکتی ہے۔ اپنے ہوس پرست بڈھے شوہر کی مجبور بیوی۔ میں کہاں دل دے بیٹھی ہوں۔ وہ میرا سچا عاشق ہے۔ میرے لیے گلبرگ میں کوٹھی بنوا رہا ہے۔ اتنا ہینڈسم۔ مینگ . . .

ارے۔ ارے۔ تمہارے بڈھے باپ کا دوست اور جوان عطرت نے پاس سے گستاخی کی۔

مگر نغمہ وہ تمہارا کرنل کھرل . . . . . ناہید چہکی۔

پھر بہت دنوں کے بعد فیروزہ نے اطلاع دی۔ سنیئے باجی!

وہ حافظ قطب الدین انصاری کی بیٹی بتول عرف نغمہ آج کل اپنی شام انٹر کانٹے میں گذار رہی ہیں۔ اسے خیال ہے۔ کہ وہاں ٹھہرا ہوا "پیر" جو آج کل اپنے لیے لڑکی پسند کرنے آیا ہوا ہے۔ اس پر مرمٹا ہے۔ کہ فیروزہ کو اس نے بتایا ہے۔ جب میں گیلری میں پہنچی۔ تو پیر صاحب کے خدام میرے سامنے جھک گئے۔ اور سرگوشیاں کرنے لگے۔

حضرت کی پسند غضب کی ہے۔۔ یہ۔

بغیر آستین کی کھلے گلے کی قمیص۔ بیل باٹم چنا ہوا دوپٹہ ترشے ہوئے بال — زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ اب گدی پر ایسی عورت آئے۔ کہ ہمارے ہاں کی عورتیں بھی ترقی کریں۔ وہاں تو سب مصلی، کمہار، ڈھیورے ایک طرح کے ہیں۔ وہی پیروں کی عورتیں کپڑے پہنیں وہی ہماری۔۔۔ سب ان پڑھ —"

میں کمرے میں پہنچی۔ تو ہزاروں مریدوں کے جھکے ہوئے سر دیکھنے والے پیر صاحب خود اٹھے۔ دروازے تک آئے۔ میری کمر میں بانہہ ڈال تک صوفے تک لے گئے۔ بلیک اینڈ وائٹ" اور شیمپین کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

کیا پسند فرمائیں گی۔

جب میں نے جواب میں کہا۔ کہ میں نے تو کبھی چکھی بھی نہیں۔ تو حیران رہ گئے۔ کہنے لگے۔ پھر آپ میں نشہ کہاں سے آگیا۔

پھر سگریٹ پیش کیا۔۔۔ بہت مجبور کر کے ایک سگریٹ ہونٹوں سے لگا ہی دیا۔ کہنے لگے ہم دونوں بزرگوں کی اولادیں ہمارا ساتھ

اچھا رہے گا۔ بلکہ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

آپ مجھے سہارا دیتی رہیے۔ میں اپنی گدی کی روایات میں تبدیلی کرنا چاہتا ہوں — میری ماں آنے والی ہے عنقریب۔

پھر۔ پھر — ہاں یہ بتائیے۔ ہنی مون کہاں منائیے گا۔ ملک۔ یا بیرون ملک . . . .

پھر بہردل یہ انرڈ کانٹ میں ان کے ساتھ گدی کی سابقہ روایات پر بحث کیا کرتیں۔ اور اپنی ذات کو محفوظ کرنے کے لیے یہ آرڈیننگی بک کروا لیا کہ:۔

تنہائی میں عورتوں سے ملاقات نہیں ہوگی۔ آپ سے
وہ اپنے مسائل لے کر میرے پاس آئیں گی۔ میں آپ کو
بتاؤں گی . . . .

جو عورت اولاد کی خواہش میں آئے گی . . . .

اسے تو ہمیشہ اپنے معتمد خاص کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس کا قصہ چھوڑیئے . . . سابقہ چیزیں بھول جائیے۔ ہماری گدی کی کیا بات ہے۔ ہر نیا بیاہا جوڑا اپنی شادی کے تین ماہ ہماری خدمت کرتے گذارہ کرتا ہے۔ یعنی ہنی مون ہمارے ہاں گذارتے ہیں۔ دلہن۔ ہماری بیویوں کی خدمت کرتی ہے۔ وہ ہماری گدی پہ آنے والوں کی جوتیاں سیدھی کرتا رہتا ہے۔ چوری چھپے دلہن دلہا ملتے ہیں۔ تو اپنی بات نہیں کرتے۔

پیر صاحب نے یہ کہا۔ ان کی فلاں کرامات دیکھی — اور دلہن بیویوں کے قصے سنائے گی۔ بڑی بی بی تو غضب کی ہے۔ بڑا دبدبہ

میں نے چھوٹی بی بی کے سر میں تیل ڈالا - اور قمیض کا لانبا ولایتی بٹن لازپ، مجھ سے بند کرواتی ہیں . . . . پیر صاحب کے بہنوئی وضو کا لوٹا مجھ سے لیتے ہیں . . .

تجھ پہ سب کی نگاہ ہے - بٹیا ہے کر جائیو یہاں سے -

ہاں -

ہاں -

مگر — اب آپ بے فکر رہیئے - اب کچھ نہ ہوگا -

اور آپ جو مجھے سگریٹ اور . . . . .

تو آپ کا مطلب ہے - یہ سب وہاں نہیں ملیں گے -

ارے بھائی - آپ وہاں جائیں گی تو پریشان ہو جائیں گی - ہماری الماریاں دیکھ دیکھ کر . . . اور آپ سے اب کیا پردہ - اکثر ہمارے پاس لڑکیاں لائی جاتی ہیں -

ہسٹریا زدہ — آپ جانتی ہیں کبھی بیاہی عورت ہی کی پوری طرح تسکین نہ ہو — یا کسی لڑکی میں ہی جوانی زیادہ بھر جائے تو مناسب بندوبست کرنے کے لیے عموماً اس کا جن بھوت نکالا جاتا ہے - تو اس جن بھوت کو کسی کے سر پہ لا کر اسے ظاہر کرنے کے لیے یہی دارو پلانا پڑتا ہے - کسی قسم کی گولیاں پڑیاں کھلائی جاتی ہیں - اسے کسی نامحرم کے بستر پر ڈال دیا جاتا ہے - پھر خوب دارو پلا کر سر عام چوکی چڑھایا جاتا ہے - اور یہ عمل چند بار کرنے سے جن بھاگ جاتا ہے - اب مجھے بھی تو عادت پڑ گئی ہے - نوخیز ہاتھوں سے پاؤں دبوانے کی — سر میں تیل ڈلوانے کی . . .

مگر آپ کی عورتیں ۔ ۔ ۔ ۔

او ۔۔ سب چلتا ہے ۔ بس آپ دیکھ لیں گی ۔ سب کچھ وہاں جا کر

نغمہ ان سب باتوں میں سرشار کبھی کمخواب کے چالیس گز کے گھاگھرے میں اپنے آپ کو ثقافتی لباس میں لپٹا پاتی ۔۔ کبھی پشواز کے متعلق سوچتی ۔

خوب آلود ماحول ۔ جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے مرید ۔

مگر چند ہفتوں بعد "پیر صاحب" ان کے پرس میں گولڈلیف کی ڈبیا چھوڑ کر اپنی ریاست اپنی گدی کو سدھار گئے ۔ ۔ ۔ ۔

ہوں ۔ ذلیل ۔ مجھ سے آگے بڑھنا چاہتا تھا ۔ میں نے ایک طمانچہ دیا ۔ اور کہا ۔

مجھے کوئی جن نہیں چمٹا ۔۔ نہ میں ہسٹریا زدہ ہوں ۔

اس کا خیال تھا ۔ کہ ۔ کہ ۔

مگر میں تو کسی موڈرن خیال آدمی سے شادی کروں گی ۔ وہ پیر آخر کہاں تک اپنے خیالات بدل سکتا تھا ۔ کہتے ہیں کتے کی دم کو کاٹ کر بارہ برس بھی شکنجے میں ڈال کر سیدھا رکھو ۔ مگر جب نکالو گے ٹیڑھی نکلے گی ۔

اے نغمہ ۔ مگر تو اسے ملنے کیوں جاتی تھی ۔

اس نے بڑی منت کی تھی ۔ اور پھر ہم تو بحثیں کیا کرتے تھے ۔ ویسے بھی مجھے یہ پتہ لینا تھا ۔ کہ مختلف بزرگوں کی اولادیں کہاں آن کر خراب ہوئیں ۔ اور کیوں ۔۔

سب کی بنیاد پھر عورت نکلی ۔

نہیں۔ ان کے اپنے ایمان کی کمزوری ۔۔

مگر یہ عورتیں وہاں جاتی کیوں ہیں ۔ پیروں فقیروں کے پاس ۔

وہ تو بیچاری ہوتی ہی جاہل اور ضرورت مند ہیں ۔ مگر یہ مرد بھی انہیں خوب خوب پائمال کرتے ہیں ۔

تو اس کا گناہ مرد کو ہو گا ۔ عورت کو نہیں ۔ اب دیکھو ناں ۔ ایک ان پڑھ گھرانے کی بیٹی اپنے والدین کا حکم مان کر اپنے پیر کی خدمت کے لیے جاتی ہے ۔ اسے خدا کا سایہ مانتی ہے ۔ یا مافوق الفطرت فرد تسلیم کر کے پاؤں دباتی ہے ۔ کہ شاید اس خدمت کے عوض اس کے والدین کا قرض اتر جائے ۔۔ ماں یا باپ کا مرض دور ہو جائے ۔۔ اور بچی جو والدین کا بوجھ ہے ۔ اس کی شادی ہو جائے ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ وہ ایک خاص قسم کے عقیدے اور عقیدت سے کرتی ہے ۔ مگر "پیر" صاحب اس عقیدت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں ۔ اور اپنی ہوس پوری کریں ۔

تو پھر گنہ گار پیر ہوا ۔۔ لڑکی تو نہ ہوئی ۔ ۔ ۔

مگر نہیں ایک مزے کی بات سناؤں ۔ پیروں کی بیویاں اور ربائیں بھی ایسے معاملات میں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں ۔ جہاں وہ اپنے خاوندوں کو بڑھاپے کی طرف بڑھتا پاتی ہیں ۔ ان کے حجرے میں جوان لڑکیوں کی تعداد بڑھا دیتی ہیں ۔

مگر یار یہ تو بتاؤ ۔۔ آج کل سچے پیر ہیں کہاں ۔

اور یہ کم بخت ڈبہ پیر قسم کے جعلی پیر روحانی بزرگوں کے بارے میں بھی شکوک بڑھاتے ہیں ۔ حالانکہ مجھے داتا صاحب سے بہت

عقیدت ہے۔ میں مزار پر جا کر فاتحہ پڑھتی، دعا مانگتی ہوں۔

مگر مزاروں پر جانا کون ضروری ہے ——" عورت کے بارے میں تو کہیں ذکر نہیں آیا۔ کہ وہ مزاروں پر گئی ہو ——

تم غلط کہہ رہی ہو ثمینہ —— عورت مزار پر جاتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ بھی نقاب اوڑھ کر جاتی تھی فاتحہ پڑھنے۔ آج کی عورت ہوائی جہاز کی میزبانی کر لے تو اعتراض نہیں۔ مگر ایک پاک جگہ جا کر نفل پڑھ لے۔ تو اعتراض کیوں ——

مگر مزار والوں سے لوگ مانگتے کیوں ہیں —— انہیں ان کے مزاروں کو خدا اور اپنے درمیان رابطہ کیوں سمجھتے ہیں۔ جب کہ خدا کہتا ہے۔ میں بندے کی شہ رگ سے بھی نزدیک ہوں ——

مزاروں سے نہیں مانگا جاتا۔ دراصل وہاں دن رات اتنی عبادت ہوتی ہے۔ کہ وہاں بیٹھ کر عبادت کرنے میں سکون ملتا ہے۔ اور جب عبادت میں سکون ہو تو قبولیت کا احساس ہونے لگتا ہے ——

خیر عبادت کے معاملے میں ہماری یہ تاجی آپا کونسی کم ہیں۔ میری تو جس وقت آنکھ کھلتی ہے۔ یہ جائے نماز پر ہوتی ہیں —— میں کہتی ہوں۔ یہ خدا کا احسان ہے۔ کہ ہمیں ان کے پاس رہنے کو جگہ ملی۔ کہتے ہیں۔ نیک ہمسایہ خدا کی بڑی نعمت ہے۔ اور یہ تو ہمارا سائبان ہوتی ہیں یہاں ——

میرے اللہ! مجھے توفیق دے کہ میں ان بچیوں کو سہارا دیتی رہوں تاجی آپا نے دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔

یہ بچیاں میرے گھر میں میکے گھر کی طرح ہیں۔ پہلے کہتے تھے۔ ترنجن کی سکھیاں اور ناؤ کے مسافر۔

دوبارہ مشکل سے اکٹھا ہوتے ہیں۔

مگر میں سوچتی ہوں۔ ہوسٹل کی لڑکیوں کا گروپ اور میرے سکول کی استانیاں ہی کب دوبارہ ملتی ہیں۔ یہ بھی تو چڑیاں دا چنبہ ہے ایک اڑیں تو . . . . ۔

مگر وہ نسیم۔ تاجی آپا کو نسیم یاد آگئی۔ یہاں ہوسٹل میں آئی تھی۔ ایم۔ اے اکنامکس کر کے بنک میں چلی گئی تھی۔ بڑے شریف اور متوسط گھرانے کی بیٹی۔ دو تین برس بعد ہی بنک کا ایک آفیسر اس سے شادی کا خواہش مند ہوا۔ اُسے کئی بار ملنے یہاں ہوسٹل میں بھی آیا۔ میں بھی اسے ملی تھی۔ کیسا معصوم شریف لگتا تھا۔ مجھے کہنے لگا۔ آپ ہی میری مدد فرمائیے۔ . . .

کئی بار اس کے لیے موتیے کے بھینی بھینی خوشبو والے اُجلے اُجلے گجرے لے کر آتا۔ جس میں سرخ گلاب کا ایک پھول پرو یا ہوتا۔

اسے شرافت سے سمجھانے کے بعد سختی سے مجبور بھی کیا۔ اور بہت سی شرائط طے پائیں۔ دونوں طرف کے والدین نے ایک دوسری طرف سے اطمینان کر لیا۔

نسیم ملازمت سے استعفےٰ دے کر بڑے ارمانوں سے شادی رچا کر سسرال پہنچی۔ تو معلوم ہوا۔ اس گھر میں پہلی بیوی موجود ہے۔ جو ساس کی سگی بھتیجی ہے۔ اور اب ساس کو اپنی بھتیجی انتہائی مظلوم لگتی ہے۔ اسے کلیجے سے لگائے بیٹھی ہے۔

اپنے خاوند کے ساتھ لاہور واپس آکر نسیم نے چاہا کہ ملازمت کرے۔ مگر شوہر ہاتھ جوڑتا۔

ایسا کرو گی۔ تو میری عزت نہیں رہتی۔

اور نسیم دکھ سے سوچتی، مرد اپنی وجاہت و وقار کے لیے بھی اچھی عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس کی منت کرتا ہے۔ اور اب اپنی عزت کے لیے بھی مظلوم عورت کو کچلتا ہے۔ وہ کہتی دیکھو تم نے میری کونسی عزت رکھی ہے۔

وہ اکثر ہوسٹل آجاتی۔ اور میرے کمرے میں قالین پر لیٹ کر رویا کرتی۔ جب میں اسے گرم گرم کافی پلاتی۔ تو وہ مجھ سے پوچھتی۔

تاجی آپا! یہ مرد ہمارا استحصال کب تک اور کیوں کرتے رہیں گے۔

مجھے احساس ہوا۔ کہ اب وہ ذہنی مریضہ ہو چکی ہے۔ کیوں کہ ایک دن اس نے اپنے تین مہینے کے حمل کو ضایع کرنے کے لیے دوا کھائی۔ اور میرے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔۔۔۔ اُف توبہ۔ جب اسے تکلیف ہوئی ہے۔ ڈاکٹر اور دائی کے آنے تک۔ معاملہ تو سب ختم ہو چلا تھا۔ مگر اس کے میاں کے آنے پر تو کسی کو اس سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی —— بہت دنوں کے بعد میں نے نسیم کو اس کی قاتلانہ حرکت پر لعنت ملامت کی —— اس کا میاں بھی یہاں ہی تھا۔ وہ اسے میرے پاس لایا تھا کہ اسے سمجھائیں۔ بالکل اس طرح جیسے وہ اپنی شادی کے لیے کہنے آیا کرتا تھا۔ کہ آپا آپ

میری بڑی بہن ہیں - اسے میری طرف سے یقین دلائیں)

میں نے نسیم سے کہا تھا - جو ہونا تھا وہ ہو چکا - اب صبر کرو - اپنے گھر کے ماحول کو خراب نہ کرو ـــــ یہ کہتا ہے - کہ اسے صرف تم سے محبت ہے - اور تمہارے ہی ساتھ زندگی گذارے گا - پھر تم اس کی اولاد کی قاتل کیوں بنی ہو ـــ بے وقوف ہماری بڑی بوڑھیاں تو کہا کرتی تھیں -

کہ اولاد ـــ میاں بیوی کا رشتہ مضبوط کرتی ہے -

میاں بیوی کا رشتہ ہی کیا - صرف جسم کا رشتہ اس کا اعتبار کیا ... اپنے خون سے نیا انسان تخلیق کر لو - تاکہ وہ تم دونوں کا سہارا بنے"۔

مگر وہ رو کر کہتی -

دیکھئے آپا - یہ بات تو میں مجید سے بھی کہتی ہوں - کہ محبت میں صرف اعتماد ہی تو ہوتا ہے - اور اس نے تو شادی سے دوسرے ہی دن میرا سارا اعتماد لے کر کھو دیا - مجھے منتوں، واسطوں، شرطوں سے بیاہ کر لے گیا تھا - اس لیے کہ وہاں جاتے ہی مجھے زندگی کی سب سے بڑی شکست سے دوچار کرے ... آپا - اب مجھے یوں احساس ہوتا ہے - کہ جیسے مجید مجھے زمین سے اٹھا کر چاند پر لے گئے تھے - اور وہاں جا کر ہماری خلائی گاڑی کھو گئی ہے - اور اب میں بے وزنی کی کیفیت سے گذر رہی ہوں -

نسیم نے پہلے دن نادرہ سے سگریٹ لے کر پی تھی۔ نادرہ کم بخت اُن دنوں K.2 قسم کا سگریٹ پی رہی تھی۔ تلخ قسم کا۔ میں نے اسے کہا تھا۔ خاوند کے دیئے ہوئے غم کا علاج سگریٹ نہیں۔ ویسے۔ فائزہ نے رائے دی تھی۔ کہ:۔

اگر خاوند نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ تو تم بھی اس سے انتقام لو۔ اور اپنے کسی پرانے ساتھی سے راہ و رسم بڑھالو — یا اسی کے کسی دوست سے۔ رومان لڑاؤ — تاکہ یہ اندر رہی اندر جلے۔ کیونکہ اگر ایک خاوند بیوی کو دھوکا دے سکتا ہے۔ تو بیوی کو حق ہے۔ کہ وہ اس سے انتقام لے —

مگر نیک دل بھولی بچی نسیم رو کر کہتی۔ مگر ایسا کرنے سے میرے غریب والدین زندہ درگور ہو جائیں گے۔ اور میری بہنیں اپنے سہروں کے انتظار میں اعصابی مریض ہو کر رہ جائیں گی ... ان سب کا خیال تو مجھے طلاق لینے سے بھی روک رہا ہے۔ ویسے ایک بات ہو سکتی ہے۔ کہ کسی دن میں ڈھیر سی خواب آور گولیاں کھا کر سو جاؤں۔ بیمار تو میں رہتی ہوں۔ میرے نوکر جانتے ہیں۔ کہ بیگم صاحبہ پریشان ہوتی ہیں تو گولی کھا کر سو جاتی ہیں۔ اس دن سب خیال کریں گے۔ کہ زیادہ کھالیں —۔۔۔ اور۔ اور۔۔۔

پھر ہم نے اس کے خاوند کو سمجھایا۔ اور اس نے اسے کالج میں لیکچرار بننے کی اجازت دے دی — اب وہ تمام دن مصروف رہتی ہے۔ مگر بے وزنی کی کیفیت سے ابھی بھی نہیں نکلی۔ جب کوئی لڑکی

شادی کرنے پر زور دیتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ وہ اس لیے شادی کرنا چاہتی ہے۔ تاکہ محفوظ ہو جائے۔

تو وہ اسے کہتی ۔ کیوں شادی کر رہی ہو ۔ تم محفوظ کہاں ہو جاؤ گی ۔ بلکہ اپنے محفوظ ہونے کے سارے چانس کھو دو گی۔ تم سے تو تمہارا تصور بھی چھین لیا جائے گا۔ جس میں تم مستقبل کا کوئی سہانا سپنا سجا سکو۔ تمہارے پاس زندگی کی تلخیوں کے سوا کچھ نہ رہ جائے گا اس لیے بہتر ہے۔ کچھ دیر اور اس تصور میں جی لو ۔ کہ تمہارا ایک بار اعتماد ساتھی ہوگا۔ اور تمہارا ایک پر سکون گھر ہوگا۔ ایک من چاہی جنت میں تم اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ بڑی ایڈیل زندگی گذارو گی۔ ... ہاں۔

شادی کروا کر تمہاری جھولی میں کانٹے بکھر جائیں گے۔ جو کبھی تمہارے سر پہ چبھیں گے۔ کبھی آنکھوں میں ۔ اور کبھی دل میں۔

شادی، ناقابل بیان ذمہ داریوں کا نام ہے۔ کہ تم انتہائی "ڈی پریشن" کی حالت میں بھی اپنے مہمانوں کی مسکرا کر خاطر داری کرو۔ اور ۔

بیچاری ۔ نسیم ۔ مجھے اس دن کیسے کہتی تھی۔

تاجی آپا! آپ خوش قسمت ہیں۔ آپ نے محبت میں شکست نہیں کھائی ۔ آپ کی پیشانی میں کسی سجدے کی تڑپ ہے ۔ مگر آپ کے کلیجے میں کسی نشتر کا زخم نہیں ۔ کسی پیارے کی موت سے زیادہ زخم زیادہ گہرا صدمہ یہ ہے۔ کہ آپ کا محبوب جیتے جی آپ کا

اعتماد کھو دے۔"

ہاں — پہلے پہل یہاں آنے والی لڑکیوں کے مسائل کیسے یکساں تھے۔ کہ سب لٹ پٹ کر آئے تھے۔ وہ سب لڑکیاں بیٹھتی تو گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی۔

تم کہاں کے مہاجر ہو —"

تمہارا کون ضلع تھا

تمہارے کتنے عزیز شہید ہوئے۔

یہاں مکان الاٹ ہو گیا۔

سامان بیت المال سے ملا تھا۔ یا:۔

مکان میں موجود تھا۔

وہاں کیا کچھ کھویا

یہاں کیا پایا —

لڑکیاں اپنے اپنے نقصان گنا کر بعد میں کہا کرتیں۔ اللہ کا شکر ہے قربانیوں کا صلہ تو ملا — ہم آزاد ملک میں آ گئے۔ قوموں کی زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور ہم خوش قسمت ہیں۔ کہ یہ قربانیاں ہم نے دیں —

مائی رکھی بھی اپنی پوتی کے سر میں جوئیں دیکھتی دیکھتی انگوٹھے کے ناخن پر دوسرے انگوٹھے کا ناخن دبا کر جوں مار کر گفتگو میں حصہ لیتی۔

اے بیویوں — ہمارے پیغمبروں پر بھی وقت آئے تھے — وقت سب پر آتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے۔ کہ وقت میں کس نے اپنے خون کی لاج رکھی۔

مگر اب سب کے مسائل انجھے الجھے ہیں۔ ہر لڑکی کا پرابلم الگ ہے
ریڈیو۔ ٹی۔ وی۔ اخبار۔ فیملی پلاننگ، بنک۔ انشورنس۔ سوشل
ویلفیر۔ ہوائی جہاز۔ یہ سب کے نئے نئے جھگڑے۔ اور ان کے
نت نئے پرابلم۔ نئے انداز گفتگو۔

تیرا پاس کیسا ہے۔
پکچر کیسی تھی۔
پکچر کس نے دکھائی۔
شام کی سیر کے لیے منی شرٹ اور بل باٹم بہتر ہے یا ساڑھی۔
بال خود ڈائی کروں یا ہیر ڈریسر کے پاس جاؤں۔
تمہارا بوائے فرینڈز۔

آخر دنیا اتنی لمبی چوڑی ہو کر یوں الجھ کر کیوں رہ گئی ہے۔ اور یہ لڑکیاں اتنی ترقی پانے کے بعد لٹ پٹ کر کیوں رہ گئی ہیں۔

وہ باتیں کرتے ہوئے کس سادگی سے اپنی محرومی کا ذکر کرنے سے نہیں چوکتی۔

جب میں گھر بناؤں گی
میں اپنے بچے کی بہترین ماں بنوں گی۔

بچہ اور گھر عورت کا فطری محور ہے۔ مگر اسے اپنی ملازمت کے گرد کولھو کا بیل بننا پڑا ہے۔

مردوں کے دوش بدوش آنے کا انتقام مرد ان سے ایسا سنگین کیوں لے رہے ہیں۔

کیا مرد ہر دور میں عورت کو محبت کا دھوکا دے کر اس کا

استحصال کرتا رہے گا —

تاجی آپا پہروں سوچتیں اور کہتیں —

یہ لڑکیاں مجھے سمجھتی ہیں میں پتھر ہوں۔ جیسے میرے جذبات ہے ہی نہیں۔ بھلا تم کیا جانو، میں تو "کسی آنے والے" کی آہٹ پہ کان لگائے برسوں محو انتظار رہی — اور جب اس کی ساری راہیں مسدود ہو گئیں — تو — اپنے احساسات پر "سکول" اور "ہوسٹل" کی کڑی ذمہ داری ڈال کر تم سب کو گود لے لیا۔

تمہیں کیا پتہ۔ رات کو اب بھی کبھی کبھی کسی ننھے منے بچے کے رونے کی آواز مجھے اپنے اندر سے سنائی دیتی ہے۔ اور میں اسے بہلانے کے لیے سرہانے تلے رکھی ہوئی "نیند کی گولی" نکال کر کھا لیتی ہوں — پھر اپنے اس رویے پر پہروں سوچتی ہوں — اور عبادت میں مصروف ہو جاتی ہوں۔

وہ تائی حکیماں (جو دلہن کے سر گُندے پر پھول بنانے اور دوپٹے پر رنگ کی بوندیاں ڈالنے کی ماہر تھی، سر گا بناتے بناتے ہمیشہ کہا کرتی تھی۔

لڑکی کی شادی اس وقت سے پہلے کر دینی چاہیئے۔ جب اسے اپنے اندر سے کسی اور کی آواز آنے لگے۔

کہتے ہیں اللہ میاں نے ہر عورت کے حساب میں ارواح جمع کر رکھی ہیں — اور — اور وہ — روح، خود اپنی ماں کو اپنا نام لے لے کر پکارتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

مگر تائی حکیماں نے جیسے یہ کہانی ہمیشہ آدھی ہی سنائی تھی —

کاش وہ یہ تو بتا دیتی —
کہ جب ماں — اس روح کو حاصل کرنے میں ناکام اور مجبور ہو — تو — ....

یہ استحصال کیا ہوتا ہے لوگو؟ -

کھانے کے کمرے میں نسرین نے بلند آواز میں پوچھا -

کیوں خیریت ــــ

میں اسی لیے پوچھ رہی ہوں - کہ نئی سیاسی جماعت نے لوگوں کے اس قدر استحصال گنوائے ہیں - کہ اب مجھے یوں احساس ہو رہا ہے - گویا میں خود ایک استحصال ہوں -

ہر پارٹی اسی طرح اپنی اشتہار بازی کرتی ہے -

مگر یہ پارٹی نہیں - ایک جماعت ہے - عوام کے لیے - یہ عوام کی پارٹی ہے -

رفتہ رفتہ ظاہر ہو جائے گا کہ اس میں عوام کہاں ہیں - دراصل یہ ایک سیاسی جماعت کا ڈھانچہ ہے - جس پر عوام کا گوشت پوست چڑھا کر اسے پرانی جماعتوں کے مقابلے میں لایا جائے گا -

ہوں ــ رفتہ رفتہ ظاہر ہو جائے گا کہ عوامی سیاسی جماعت دراصل عوام ہی کا استحصال کرنے کے لیے بنائی گئی ہے -

ہاں، تا کہ ملک سے غریب ایک دم ختم ہو جائیں -

نہیں جاگیرداری کا خاتمہ ہوگا - امیروں کی جاگیریں چھین کر غریبوں میں بانٹ دی جائیں گی -

ہاں عوام کا استحصال کرنے کو یہ یقین دہانی کافی ہے۔ جس طرح لوگ اسلام اسلام کا نعرہ مار کر اپنا نفع حاصل کرتے ہیں۔ اور اسلام کا استحصال کرتے ہیں۔

اسی لیے تو ملک میں خیر و برکت نہیں رہی۔

لوگوں نے تو خیر و برکت کا بھی استحصال کر دیا ہے۔

در اصل فوجی آمریت نے ہم لوگوں کی قوت سوچ و فکر ختم کر دی ہے۔

نہیں ہم عادی ہو گئے ہیں۔ کہ کسی نہ کسی ہیرو کو پوجتے رہیں۔ جب ہم میں سے یہ عادت ختم ہو جائے گی۔ یہاں خود بخود ہی جمہوریت بحال ہو جائے گی۔

جمہوریت بحال ہو یا فوجی آمریت۔ یہ بتاؤ ہمیں کیا ملے گا۔

میں تو صرف یہ چاہتی ہوں۔ کہ ملک میں بڑھتے ہوئے افراط زر پر قابو پایا جائے۔

تو سمگلنگ بند کر دو۔

تم ہی جاتی ہو باڑہ سے کپڑے خریدنے۔

ہم بیچنے کے لیے تو نہیں ناں خریدتے۔

اپنا نفع تو حاصل کرتے ہو

تو یہ لوگ جو ایبٹ آباد میں کیمپ لگاتے ہیں یا مری میں۔ وہاں سے بھی تو سب لوگ کپڑا خرید کر لاتے ہیں۔

ہاں۔ یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ کہ اس ملک میں سمگلنگ کا کاروبار بند نہیں ہو سکتا۔

پینسٹھ کی جنگ کے بعد بھی یہ لوگ دیکھ لو۔ انڈیا کو اناج سمگل کرتے ہیں۔

دراصل ہماری قومی غیرت مرچکی ہے۔

یوں تو نہ کہو۔

ہاں ـــ ٹھیک ہے۔ ہمارے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔

مگر اسے جگایا کیسے جائے۔

آؤ نئی پارٹی جوائن کرلیں۔

نہیں آؤ۔ پہلے اپنے آپ کو بیدار کرلیں۔

نچلی منزل سے یہ دھما دھم کی آواز کیسی آ رہی ہے ۔
یہ گالیوں کا طوفان کیسے اُمڈ پڑا ۔ اپنے اپنے کمروں سے لڑکیاں ایک دم باہر نکل آئیں ۔ اور ابھی وہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے کامن روم تک بھی نہیں پہنچ پائی تھیں ۔ کہ تاجی آپا کی بھابی عقیلہ اپنا سینہ پیٹتی ۔ ہوسٹل کی تمام لڑکیوں سے اپنے خاوند کے ناجائز ترین تعلقات استوار کرتی اوپر کی منزل میں آ چکی تھی ۔ ہر لڑکی کا چہرہ اسے اپنا رقیب نظر آ رہا تھا ۔ اور وہ بے طرح برس رہی تھی ۔

یہ آوارہ —— ذلیل کمینیاں کہاں سے اکھٹی کر رکھیں ہیں ۔ تو نے
وہ تاجی آپا کی طرف بڑھی ۔

کمینی تجھے تو کوئی تھوکنے بھی نہ آیا ۔ ساری عمر ہمارے زندگیوں سے کیوں جلتی رہی ۔ سے —— اب اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لے ۔ تیرے اندر کی آگ اسی طرح بجھتی ہے ۔ تو بجھا لے ——

تو نے ذلیل عورت ۔ یہاں میری اتنی ساری سوکنیں کیوں اکھٹا کر لی تھیں ۔ میں پسند نہیں تھی تو خود کر لیا ہوتا بھائی سے نکاح ——

مجھے کیا پتہ تھا ۔ ہوسٹل کے پردے میں تو نے ناجائز کاروبار

شروع کر رکھا ہے۔

سوکنیں —

ناجائز کاروبار —

ہر چہرہ سوال بن گیا۔ ناجی آپا تڑپ کر بھائی کے پاس پہنچی — آخر بات کیا ہے۔

بات یوں کھلی۔ کہ اکبر نے قمر چوہدری سے شادی کر رکھی تھی۔ خفیہ۔ جس کا علم عقیلہ کو آج ہوا۔

قمر چوہدری ایک بار ہوسٹل میں چند روز رہی تھی۔ وہ کسی فرم میں ٹیلی فون اپریٹر تھی۔ اکبر کی اس سے واقفیت کہاں اور کب ہوئی۔ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ لڑکی چند روز رہی تھی۔ بڑی چپ چاپ۔ اسے گئے بھی سال بھر ہونے کو آیا۔ وہ یہاں اتنا کم عرصہ رہی تھی۔ کہ کسی کو ڈھنگ سے اس کا چہرہ بھی یاد نہ تھا۔

مگر عقیلہ تو اس جرم میں ناجی آپا کے علاوہ ہر لڑکی کو شریک کر رہی تھی۔ آپا بہتیرہ ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ مگر وہ مصر تھی۔ کہ رات سے قبل ہوسٹل میں تالا ڈال کر رہے گی۔

بلکہ اس کی حمایت میں ابا اور اماں بھی آئے — اماں تو اپنی ہی کہے جا رہی تھی کہ:۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ کہ کوئی گل کھلے گا۔ مگر مجھے کیا پتہ تھا۔ یہ حرام زادیاں میرا ہی کلیجہ نوچیں گی۔"

اماں — خدا کے لیے آپ تو چپ ہو جائیں — وہ سب، میری بیٹیاں ہیں۔ ناجی آپا آگے بڑھیں۔

اے ہے — تو ان آوارہ چھوکریوں کے پیچھے کیوں اپنی پارسائی کھوتی ہے —— اماں تڑپیں۔

مگر آپ اپنے خون کو سمجھانے کی بجائے انہیں کیوں کوس رہی ہیں —

کوسوں گی۔ کوسوں گی، ہزار بار کوسوں گی۔

دہائی خدا کی۔ انہوں نے میرے کلیجے میں چھید ڈال دیا۔ اور میں زبان بند رکھوں۔

اور میں تو انہیں جوتیاں مار مار کر یہاں سے نکالوں گی — ست خصمیوں کو۔

زبان سنبھال عقیلہ —— تاجی آپا نے تنبیہ کی۔

تجھے اس جلاپے کا اندازہ کیا۔ تجھے تو لے کر جانے سے پہلے ہی لوگ تھوک گئے۔ تیرے پہ سوکن آتی تو دیکھتی تیری زبان۔ بڑی آئی زبان والی۔

مگر عقیلہ تو اپنے شوہر کو سمجھا۔ جب جلسوں میں لڑکیوں کو ہار پہناتا پھرتا تھا۔ اس وقت تو تم سب خوش تھے۔ کہ اکبر — صدر ایوب کو گالیاں دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں آ رہا ہے۔ کیا خبر یہ دوستی انہی جلسے جلسوں کی ہو — ہوسٹل کی لڑکیوں کا کیا قصور ہ؟

وہ بھی یہاں ہی رہی تھی —— ان کا قصور ہی نہیں۔ آخر یہاں رہ کر دیدہ لگایا تھا۔ تو کسی سے بات تو کی ہوگی۔ تجھے بھی پتہ ہوگا۔ نوجوان کے گھنی بن گئی ہوگی۔ دیکھ اب میں تیری لاڈیوں کو کیسے

یہاں سے نکالتی ہوں ــــ عقیلہ پھر کامن روم میں بیٹھ کر سیاپا کرنے لگی - اور لڑکیوں کا اپنے شوہر ــــ اپنے ننھے منے بیٹے تک سے گندے گندے رشتے جوڑنے لگی -

آخر ابا اوپر آئے - اور لڑکیوں کو کہیں اور "بندوبست" کرنے کا کہہ کر چپ چاپ نیچے اتر گئے -

اور لڑکیاں چپ چاپ جہاں تھیں وہیں رہ گئیں - یہ ایک نہ ایک کمینی ایسی نکلتی ہے - جو ہوسٹل کو ختم کروا دیتی ہے -

بہت دیر بعد تابندہ بولی -

مگر اب جائیں کہاں ــــ یہاں سے وہاں تک - ایک سوال ابھرا قدم قدم پہ ہوسٹل موجود ہیں - مگر ماحول ــــ

وہ زیبا کا ہوسٹل یاد ہے - جہاں شوربہ پلیٹ میں علیحدہ ڈال کر دیا جاتا تھا - اور کوفتہ علیحدہ روٹی پر رکھا ہوا آتا تھا -

ہاں - کوفتہ بھی تو چنے کی ابلی دال - آلو - اور روفی صد قیمہ کا ہوتا تھا -

وہاں کھانے کی تکلیف جو ہے سو ہے - مگر وہ ان بہن بھائیوں کی لڑائی -

اس کی باجی بڑی ظالم ہے - اس کم بخت سے پیسہ پیسہ بٹور لیتی ہے اور پھر بھائی سے کہتی ہے - یہ لڑکی ہمیں کچھ نہیں دیتی - علیحدہ جوڑتی ہے - وہ ظالم رات کو اسے مارتا ہے - اور وہ لڑکیوں کے کمروں میں پناہ پانے کو دوڑتی ہے -

اس کی باجی میں ایک بات اور ہے - جہاں اس کے سسرال سے

کوئی آیا۔ لڑکیوں کے کمروں سے میز پوش۔ برتن، پردے تک اٹھوا لے جاتی ہے۔ اور پھر واپس نہیں کرتی۔

ہاں۔ اپنی پارسائی کا ڈھنڈورا بہت پیٹتی ہے۔ مگر بہن پر اس قدر ظلم کرتی ہے۔

بیگم آغا کا ہوسٹل۔

قطعی اڈا ہے۔

خانم والا —

بس یوں سمجھو کہ ہم کسی چورا ہے میں کھڑے ہیں۔

اور یہ نیم سرکاری ہوسٹل —

اس کی وارڈن قطعی بکواس ہے۔ ہر آوارہ لڑکی کی طرف دار کیوں کہ وہ واپسی پر اس کے لیے — کون — تکے — چرغہ — کباب پان لیتی آوے گی۔

ہاں مجھے بھی یاد ہے۔ جب بلقیس بھاگ گئی تھی۔ آٹھویں دن بعد پولیس نے کسی ہوٹل پر چھاپا مارا۔ تو وہاں سے برآمد ہوئی۔ مگر ہوسٹل میں وارڈن نے اس کی حاضری باقاعدگی سے لگا رکھی تھی۔

قیصرہ اور شائستہ کو بھی اس نے بہت سر چڑھا رکھا تھا۔ قیصرہ نے تو مری سے اسے شال لا کر دی تھی۔

مگر تم اپنے کالج کے ہوسٹل کیوں نہیں چلی جاتیں نعیمہ —

یار وہاں ہوسٹل پر تو پرنسپل کی بھتیجی کی اجارہ داری ہے — پہلے میں وہاں رہتی تھی۔ مگر وہاں کی کمینگی دیکھ دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میں خود انتہائی کمینی ہوں۔

آخر ایسی بھی کیا۔

سچی۔ مائی کو آرڈر تھا۔ کھانا لائے تو اسے اطلاع کرے۔ سالن آتا تو اپنا سالن نکال کر رکھ آتی۔ بوٹیاں چن کر نکال لیتی۔ پلاؤ کی دو تین بوٹیاں اٹھاتی نوچتی۔ اور ہڈیاں باقی ڈش پر رکھ دیتی۔ دودھ گلاس بھر کر لے لیتی۔ باقی چائے کو ترستے رہتے —— ہوسٹل کی مائی سے اپنا کام کرواتی۔ بلکہ جب سے بیاہی گئی ہے۔ اپنا بچہ بھی انہی کے سپرد کر دیتی۔ ہم لوگ بازار سے چیز منگوانے کو ترس جاتے۔

مگر یار رہا کہاں جائے۔ یہ اپنی انجمن حمایت اسلام برسر روزگار لڑکیوں کے لیے ہوسٹل کیوں نہیں بنا دیتی۔

یہ کرسچین دیکھ لو۔ ہر بڑے شہر میں لڑکیوں کا ہوسٹل موجود ہے۔ ہمارا محکمہ اوقاف ہر ماہ مزاروں کی آمدن سے مستحق لڑکیوں کو جہیز دیتا ہے۔ مگر سروس کرنے والی لڑکیوں کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں۔ کہ ان کے لیے رہائش کا بندوبست ہی کر دیں۔ ڈھنگ سے۔

کیا تم یہاں رہو گی۔

یہاں رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ عقیلہ اب ہر لڑکی کو بدنام کیا کرے گی۔

اور رتاجی آپا سوچ رہی تھی۔ ہوسٹل بند کرنے کا اعلان کیوں کیا گیا ہے۔ یہاں آنے سے قبل ہی اکبر نے قمر سے نکاح کر لیا تھا۔ ابا نے ہوسٹل بند کرنے کا تو کیا۔ مگر خود اپنے خون کو نہیں سمجھایا۔ اس نے یہ ذلالت کیوں کی۔ اپنی بہو کو نہیں سمجھایا۔ کہ اس نے اپنے خاوند کو ہر بار

کیوں مایوس کیا۔ اپنی ضدی عادت سے۔ وہ غیروں میں پناہ ڈھونڈتا پھرا۔ انہیں بہو عزیز ہے — ان کی بدزبان بہو نے میری اتنی بے عزتی کی۔ تو اسے زبان بند کر دینے کا بھی نہیں کہا۔

میرے ہوسٹل نے انہیں بھی اقتصادی مدد دی تھی۔ اب ان کا کاروبار چل نکلا ہے۔ بچے بیاہے گئے۔ تو انہیں بھی ہوسٹل عیاشی کا اڈا نظر آنے لگا۔ مگر میں کیسے بند کروں۔ آج اسے بند کروں۔ کل کو سکول میں بھی انہیں کوئی ناجائز بات نظر آجائے گی۔

مگر تاجی آپا ہوسٹل بند نہ کرنے کا عزم کر بھی لیتیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ لڑکیاں اپنی بے عزتی سے اس قدر دل برداشتہ تھیں۔ کہ اپنے ایڈوانس دیئے ہوئے پیسوں کی بھی پرواہ نہ کی۔ اور اپنے اپنے ٹھکانے تلاش کرنے لگیں۔ جب کوئی لڑکی اپنا سامان سمیٹ کر تاجی آپا سے رخصت کی اجازت مانگتی۔ ان کا شکریہ ادا کرتی۔ اور ان کے لیے دعا مانگ کر سیڑھیاں اتر جاتی تو تاجی آپا پہروں خاموش بیٹھی رہتی۔ اب وہ زیادہ وقت سکول کے آفس میں گذارتیں۔

اکبر کا خیال تھا۔ ہوسٹل بالکل ختم نہ کیا جائے۔ بلکہ پیپلز پارٹی کی ایک شاخ یہاں قائم کر دی جائے — آپا یہاں کی صدر یا سیکرٹری بن جائیں — مگر آپا کسی طور بھی راضی نہ ہوئیں۔ وہ تو الیکشن کے زمانے میں بھی راضی نہ تھیں۔ کہ اب سیاست سے وابستگی اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ پہلے اتنا کام کر کے اسے کیا ملا تھا۔ مگر اکبر اور سجاد نے علاقے بھر کے جھنڈوں سے اونچا جھنڈا اسکول کی چھت پر گاڑ دیا تھا۔

الیکشن کے دنوں میں سکول ہی کو انہوں نے اپنی ووٹروں کے بیٹھنے کے لیے ویٹنگ روم بنایا تھا۔ یہاں دیگیں پکی تھیں۔ اور دن رات ٹی۔ وی کے پروگرام دیکھتے ہوئے اکبر آپا سے کہتا۔

آپا — بس اب انقلاب آیا کھڑا۔ تم نے پاکستان کے لیے جو کام کیا تو یہاں آکر تمہیں کیا ملا — ذرا بھی کسی نے مالی فائدہ نہ پہنچایا اور ان جھمیلوں میں تمہاری شادی بھی تو نہ ہو سکی۔

اور تمہاری شادی تمہاری حکومت کے آنے سے بھی قبل ہو گئی۔

ہیں ناں — آپا چڑ کر کہتی۔

آپا دیکھ لینا —— کتنے فائدے ہوتے ہیں۔ دو چار وزیر تو اپنے واقف آہی جائیں گے۔ پھر دیکھ لینا۔ میں گذشتہ ساری کسریں نکال لوں گا۔ یوں کرو — سکول پر پورا قبضہ رکھو۔ مگر دو کمروں میں ایسی لڑکیاں رکھ لو — جو ہمارے کام آسکیں —— میں کہتا ہوں ہوسٹل کا سن کر تو اچھے اچھوں کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔

تمہارا کیا مطلب ہے۔ تم میرے گھر کو بقول عقیلہ عیاشی کا اڈا بنانا چاہتے ہو — یہ کبھی نہ ہو گا — تاجی آپا چیخ دیں۔

اب ان کے بالوں میں سفید تاروں کی اکثریت تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی پندرہ چوڑیاں جو انہیں متمول گرہستی ظاہر کرتیں۔ مگر ان کی بھابی قمر چوہدری کو ان کے فیشن اچھے نہ لگتے تھے۔

وہ خود بیل باٹم پہنتی۔ اس کی دیکھا دیکھی عقیلہ نے بھی سلوا لیے اب دونوں بالوں کے سٹائل بدلواتی رہتیں۔ انہوں نے دو تین قسم کے سوئچ اور دیگیں لے رکھی تھیں۔

ہوسٹل کے خالی کمروں میں قمر چوہدری ہی گھوما کرتیں۔ بلکہ وہ چاہ رہی تھی کہ یہاں ایک بیوٹی کلینک کھول لیا جائے۔ اس کی ایک دوست کو اس کام کا کچھ تجربہ بھی ہے۔ وہ کراچی بیوٹی پارلر میں کام کرتی رہی ہے ۔۔ بیوٹی کلینک کا افتتاح فلاں وزیر کی بیگم سے کروا لیا جائے۔ تو آپا دھک سے رہ جائیں۔ انہیں یوں لگتا۔ جیسے بڑھاپے میں اُن کی سوتیلی اولاد نے (جس پر انہوں نے بہت جان ماری تھی) جن کے سہارے اس نے عمر گذاری تھی۔ اسے اب تنہا چھوڑ گئی ہے۔ اب وہ غیروں کے ہاں سر چھپائے ہوئے ہے۔ جہاں نہ کوئی اس کی بات سمجھ کر سکتا ہے۔ نہ خیالات کا ساتھ دے سکتا ہے۔

اللہ! ہم نے پاکستان کی تحریک میں کام کیا۔ ہمیں جتنا حکم ملتا۔ ہم اس سے زیادہ ایثار، دیانت داری اور جذبے سے کام کرتے ۔۔ ہمارے سامنے وہ مثالیں تھیں۔

جب ڈیرہ دون میں مسلم لیگی خواتین پہنچیں۔ تو عوام کی بستی میں اپلے کے ڈھیر پر شطرنجی بچھا کر جلسہ کیا۔

وہ بھی سنا تھا۔ کہ مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ میں چندے کے لیے ٹکٹ لگائے گئے تھے۔ خواتین کے لیے دس روپے، مردوں کے لیے ۱۰۰ روپے نواب بہادر یار جنگ نے صرف اتنا کہا تھا۔

کہ پنڈال سے باہر جانے کے قبل ہمیں ایک لاکھ روپیہ اکٹھا کرنا ہے پنڈال میں موجود خواتین نے اپنے زیورات اتار کر دے دیئے۔ اور کچھ لوگ پاکستان کے نقشے سونے اور چاندی سے بنا کر لائے۔ پو پھٹنے سے قبل اعلان ہوا۔ کہ ایک لاکھ سے آٹھ ہزار زائد چندہ ہو چکا ہے

لوگ اپنی قیمتی اشیاء اور زیورات لے جائیں - مگر کسی نے چیز واپس نہ لی - ہمیں ایک دوسرے کے ایثار کا سن کر جوش آیا کرتا تھا - اسلام کے لیے - پاکستان کے لیے —

مگر اب یہ سب کیا ہے — یہاں وزیروں کی بیگمات بیوٹی کلینک کا افتتاح کرتے ہوئے قوم کو سادگی کی تلقین کرتی ہیں - یہ ملک و قوم میں کیسی دو رنگی آگئی ہے - ہم کس قدر بے حس ہیں - کہ جنگ میں اپنے نوے ہزار افراد بھارت ایسے سفاک دشمن کی قید میں دے کر ہم یہاں جشن مناتے ہیں - وہ جشن جمہوریت ہو یا —

مگر وہ کسے سمجھاتی - اُسے تو ایک ہی طعنہ تھا -

تمہیں کام و خدمت کا کیا صلہ ملا ہے —

خدمت کا صلہ — یہ پاکستان تھا — دُکھا اس کا دل رو دیتا، ہم نے اتنا بڑا پاکستان حاصل کیا تھا — تمہاری کمزوری کہ تم اسے سنبھال نہ سکے - اور اسے علیحدہ کر دیا — ہماری خدمت کا صلہ یہ پاکستان ہے - جس میں تم من مانی کر رہے ہو -

میں خدمت نہ کرتی تو شاید پاکستان مکمل نہ ہو پاتا - اور تم آج بے وطن ہوتے — ہم نے تمہیں آزاد پر وقار ملک دیا تھا -

ہم نے ہمارے ساتھیوں نے، ہمارے لیڈروں نے بھی عوام ہی کی مدد سے پاکستان حاصل کیا تھا - مگر تم نے تمہارے لیڈروں نے عوام ہی سے مجبور ہو کر پاکستان کو دولخت کر دیا -

ماں کہتی — جن بیگمات کے ساتھ تم کام کیا کرتی تھیں - انہوں نے یہاں آکر تمہارے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کی - مگر دیکھو - اپنی قمر کے

اشارے پر وزیر اور اس کی بیگم آ گئے تھے۔

اکبر کہتا۔ آپا میں نہ کہتا تھا۔ آپ کی سیاست نے آپ کو کچھ نہ دیا۔ مگر میری سیاست اب آپ کے سکول کو کالج بنوا دے گی۔

کالج —۔ وہ سوچتی کالج تو فاطمہ بیگم مرحومہ نے بھی سوچا تھا۔ اور نواں کوٹ میں اردو یونیورسٹی بنانے کا اظہار کیا تھا — مگر — مگر —

عین اسی شام ریڈیو پر اعلان ہوا تھا کہ تمام نجی
تعلیمی ادارے سرکاری تحویل میں لے لیے جائیں گے —

تاجی آپا سن سے رہ گئیں — لے — دے کے اک سکول ہی تو سہارا تھا۔ وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اس عمر میں کیا اب میں قمر کے بیوٹی کلینک کے استرے کنگھیاں صاف کیا کروں گی۔ میرا ہوسٹل ہی ہوتا۔ وہ کہتے ہیں۔ اس جنگ میں شکست پر کسی شاعر نے کہا تھا۔

جس دور میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس دور کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ گویا یہ پورا دور بھول بھلیوں کا ہے۔ ہم سب راہ گم کردہ ہیں۔ یہاں کوئی کسی کا رہبر نہیں۔ کوئی رہنما نہیں۔ یہاں راہ نما ہی بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہاں ہم سب کی باطنی آنکھ اس قدر کمزور ہے۔ کہ ہم برے بھلے کی تمیز بھی نہیں کر پاتے —— یہ کیسا زمانہ آگیا ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔

ہم ۱۹۴۷ء میں لٹ لٹا کر یہاں آئے تھے۔ تو مطمئن تھے۔ کہ قربانی کچھ کام آئی۔ اور اپنے پاکستان میں سر چھپانے کا آسرا ہے۔ مگر اب

اتنے برسوں بعد یہ افراتفری یہ بے اطمینانی کیسی۔
محکمہ تعلیم شروع ہی سے کنواری اور اجڑی ہوئی لڑکیوں کی پناہ گاہ تھا۔ یہ ٹھیک کہ اکثر پرائیویٹ سکول اپنے دو رجسٹر رکھتے تھے۔ ایک میں اصل تنخواہ اور ایک جعلی۔ مگر اس طرح بہت سی لڑکیوں کو آسرا تھا۔۔۔۔ اب کوئی میری طرح کی لڑکی اپنے آپ کو سہارا دینے کے لیے ان سکولوں سے بھی گئی۔
یہ قوم — نودولتوں کی طرح اپنے بزرگوں کی روایات کو کیوں ختم کر رہی ہے۔ جیسے نودولتوں کے گھروں میں ہر چیز نئی ہوتی ہے وہ پرانی چیزیں کاٹھ کباڑ میں ڈال دیتے ہیں۔ کباڑیوں کے ہاتھوں اونے پونے بیچ ڈالتے ہیں۔ اور ضرورت مند انہیں کباڑیوں سے بھی خرید لاتے ہیں۔ ملک کی بیشتر روایتی چیزیں جھگی نشینوں، کباڑیوں کے ہاں نظر آتی ہیں۔ ثقافتی مظاہروں پر اکثر لڑکیاں لباس اور زیور، چھابے پیڑھیاں انہی لوگوں سے حاصل کرتی ہیں۔ مگر اب تو جھگی نشین بھی جب سے سرکار کی "عوام" بنے نئے دور میں آگئے ہیں۔ پرانی چیزیں تو اب لوک داستانوں کا حصہ بن گئی ہیں۔ کیا یہ دور نودولتوں کا ہے۔۔
نودولتے۔ پیسہ پاتے ہی اپنے ہاں کے بزرگوں کا منہ پیسہ دے کر بند کر دیتے ہیں۔ یا ان پر طرح طرح کے الزام لگا کر ان کی ساکھ ان کی آواز ختم کر دیتے ہیں —
یہی کچھ ہر جگہ ہو رہا ہے۔ پرانے لوگوں، پرانی تحریکوں، اخباروں رسالوں پر پابندیاں لگ رہی ہیں۔ ادارے ختم کیے جا رہے ہیں۔ بلکہ ہر وہ طاق بند کیا جا رہا ہے۔ جس میں ان کی ڈفلی اور بانسری فٹ نہ آسکے۔

سب لوگ سر جھکائے ہر بات قبول کیے جا رہے ہیں۔ الٰہی۔ ان کا حشر اس قوم کا سا تو نہیں ہوگا۔

جہاں چنگیز خاں پہنچا۔ اور اس نے شہر کے برسر اقتدار لوگوں کو قتل کروا دیا شکست دے کر۔ مگر رات کو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا۔ کہ شہر کے لوگ جشن منا رہے ہیں۔ چراغاں کر رکھا ہے۔

چنگیز خاں نے پوچھا۔ یہ جشن کیسا ہے۔

جواب ملا۔ یہاں کے حاکم سخت جابر اور ظالم تھے۔ اُن کی قوم ان سے نجات پا کر جشن منا رہی ہے۔

چنگیز خاں نے حکم دیا ــــ

اس پوری بستی کو آگ لگا دو کہ ان باشندوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ جو اس قدر ریزہ دل بے حمیت تھے کہ اتنا عرصہ ظالم کا ظلم برداشت کرتے رہے۔ یہ زندہ رہ کر کیا کریں گے ــــ

اپنے ہی گھر کو کیوں نہ دیکھوں۔ قمر کے آنے سے ابا کیسے پھرتے ہیں اترائے اترائے۔ اس کے بیوٹی کلینک کی یہ بات انہیں بھاتی ہے بڑے بڑے رؤسا اور امیروں وزیروں کی بیگمات سے واقفیت ہے۔ ٹیلیفون پر ان سے بات کر سکتی ہے ـــ ہا ـــ میرے ابا یہ نہیں دیکھتے۔ نئے ماحول میں ان کی روایات کس بے طرح پائمال ہو رہی ہیں۔

ہمارے چہروں پہ تو جلسوں میں بھی نقاب نہیں سرکی تھی۔ اور

اب اپنی بہو بیٹیاں سر پہ دوپٹہ بھی نہیں لیتیں۔
پوتیاں تو خیر سے دوپٹے سے واقف ہی نہیں۔ گھر سے باہر جائیں تو ڈیوڑھی سے ہی ہانک لگاتی ہیں۔
بائی بائی — بڑے ابا —
اور ابا کسی فخر سے انہیں اُسی آواز میں ٹا — ٹا — کہتے ہیں۔
ان کے انگلش کے سبق ابا کو زبانی یاد ہیں۔ ۔ ۔ سب ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر ٹی۔ وی دیکھتے اور فلموں پر بحث کرتے ہیں۔
ہا — ہم لوگ۔ اپنی روایات تج کر کس قدر خوش ہیں۔
فاطمہ بیگم مرحومہ کی بڑی بھابی جنت خاتون ٹھیک کہا کرتی ہیں۔ کہ ہم لوگ فیشن میں ایک دوسرے سے دو چار قدم آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ناجائز یافت ہمارے ہاں اتنی افراط سے ہے۔ کہ قوم سرمایہ لگاتے ذرا رحم نہیں کھاتی۔ ہم میں کم مصرف اعلےٰ کارکردگی کا سلیقہ ہی نہیں رہا۔
وہ بتایا کرتی تھیں :-
جنگ عظیم کے دنوں میں پنجاب کا گورنر انگریز تھا۔
اس کی بیگم نے عورتوں کی انجمن بنائی۔ اور کہا کہ ریڈ کراس کے لیے چندہ اکٹھا کیا جائے۔ تاکہ ہم لوگ اپنے زخمیوں کی مدد کر سکیں۔
چندہ اکٹھا کرنے کے لیے ایک "مینا بازار" منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہماری بیگمات نے اپنے اپنے پرس اور چیک بکیں نکال لیں۔ مگر گورنر کی بیگم نے

مسکرا کر کہا۔

ہم فالتو چیزیں کام میں لائیں گے۔ ہمیں کام کی ضرورت ہے۔

تب اس نے ہر بیگم کی ڈیوٹی لگا دی۔ اور تجویز پیش کی۔ کہ ہر ممبر خاتون اپنے گھر اور اپنے ارد گرد کے گھروں سے خالی بوتلیں، خالی ڈبے، پرانے کپڑے، بیکار اشیاء ردی کاغذ کتابیں جمع کرائے گی۔ اور اسے یہاں جمع کروائے گی پرانے کپڑے جو آئیں۔ اسے فلاں فلاں بیگم پاگل خانہ میں لے جا کر پاگل عورتوں سے کہے۔ کہ اسے بیٹھی بیٹھی لیر لیر کرتی رہیں ردی اشیاء اکٹھی ہوں۔ تو کباڑیوں سے کہا جائے۔ آ کر بھاؤ کر کے خرید لیں۔

اس طرح صرف ایک ہفتہ کے اندر اندر منوں کاغذ، ٹنوں بیکار اشیاء اکٹھی ہو گئیں۔ کباڑیوں نے آ کر خرید لیں۔ تار تار اور لیر لیر کپڑے پاگل خانے سے واپس لیے۔ گڑیاں بنائی گئیں۔ اور وہ تار تار کپڑے ان گڑیوں کے اندر بھرے گئے۔ جو بیکار اشیاء بکیں۔ اُن سے مینا بازار کی اشیاء خریدی گئیں۔ اور یوں مفت ہی مفت میں بیکار اشیاء سے ہزاروں کی آمدن ہوئی۔

مگر اب ہماری نو دولتی بیگمات مینا بازار لگاتی ہیں۔ تو ساری توجہ چائے اور چاٹ پر دیتی ہیں۔ جس سے ظاہر ہے۔ ہماری نیتیں ہی بھوکی ہیں۔ ہائے ہماری قوم میں یہ بھوک جانے کدھر سے داخل ہو گئی ہے۔ ہم، سب سطح سے واسطہ رکھتے ہیں۔ تہ تک

نہیں پہنچ پاتے ۔ ہم ہی تجسس اور تحقیق کا جذبہ کم پڑتا جا رہا ہے
تاجی آپا، کیا کچھ نہ سوچتیں ۔ پھر ریڈیو پر تینوں وقت انڈیا سے نشر ہونے والے جنگی قیدیوں کے پیغام سنا کرتیں ۔ ان کا اپنا کوئی عزیز نہ تھا وہاں ۔ مگر وہ ان کے اس پیغام پر ہمیشہ رو یا کرتیں ۔ کہ ہم خیریت سے ہیں ۔ پھر وہ اپنے آپ سے کہتی :۔

میں سکول اور ہوسٹل سے الگ ہو کر تمام دن کوئی شے اپنے اندر ٹوٹتی ہوئی محسوس کرتی ہوں ۔۔

اور مجھے احساس ہے ۔ کہ میرا باطن بیمار ہے ۔ میرا ظاہر بے دست و پا ہو چکا ہے ۔ اور تم جو کال کوٹھڑیوں میں اپنے عزیزوں سے دور رہتے ہوئے شیشے ملی روٹیاں اور رجال گوٹے والی دال کھاتے ہو ۔ تم خیریت سے کہاں ہو ۔

ہا ۔۔ ہم لوگ' ایک دوسرے کو جھوٹی تسلیاں دینے میں کس قدر ماہر ہو گئے ہیں ۔

باصرہ کا بہنوئی قید تھا ۔ نسیمہ کا بھائی ۔

تابندہ کا شوہر ۔ بلقیس کے دو بھائی اور باپ ۔

اللہ جانے ۔ سب کے کتنے عزیز تھے ۔ تاجی آپا سب کا دکھ اپنے سینے میں محسوس کرتی ۔ نیپال کے راستے جب بلقیس کا ایک بھائی پاکستان پہنچا ہے ۔ تو وہ ان کے گھر مبارک کہنے گئی تھی ۔

مگر اب تو تاجی آپا اس سوچ میں گم رہتی تھیں ۔ کہ اسے کیا کرنا ہے اب وہ نئے سرے سے صنعتی مرکز تو قائم کرنے سے رہی ۔ جو ہر بے آسرا خاتون کی آخری پناہ گاہ ہوتا ہے ۔۔ قوم کتنی بھی ترقی کر جائے ۔ عورت

کو کسی کونے کھدرے ہی میں جگہ دیتی ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے اسے یہ مشورہ بھی دیا تھا۔ کہ کسی جگہ مکان کرائے پر لے کر ہوسٹل وہاں کھول لیا جائے۔ تجویز معقول تھی۔ مگر پاؤں میں جو خاندانی بندھن تھے۔ انہیں کون توڑے۔۔۔۔

کہ وہ گھر کی بڑی اولاد تھی۔ اس نے آج تک والدین کے حالات سے مطابقت کی تھی۔ سر جھکا کر ان کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اُن کے سامنے بغاوت نہ کی تھی۔ اب اگر گھر کے بڑے لوگ بھی نئے زمانے کی چمک دمک میں کھو گئے۔ تو اس کا کیا قصور۔۔ اس نے تو اس گھر پر بڑی جان ماری تھی۔

کہ اس نے تو اس پورے ایک دور کو اپنے اوپر سے گذارا تھا وہ پرانے اور نئے دور کے درمیان ایک رابطہ تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ لوگ رشتہ کامیاب ہونے کی صورت میں بیچولڑی کو جلد بھول جاتے ہیں۔ مگر ناکامی کی صورت میں ساری ذمہ داری بیچولڑی پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ شکر کہ اس کا دور اس کا رابطہ کامیابی کی مثال تھی۔ کہ اب اس کی قطعی ضرورت کسی کو بھی باقی نہ رہی تھی۔

اکبر نے دوڑ دھوپ کر کے ہائی سکول کے کمرے خالی کروا لیے تھے۔ اور اس میں چیلنج گارڈ کا چھوٹا سا آفس بنا لیا تھا۔ کہ عمارت اپنے پاس رہے۔ ہوسٹل والی عمارت میں تو قمر چوہدری کی رہائش کے ساتھ بیوٹی کلینک کھول رکھا تھا۔ عقیلہ کیوں پیچھے رہتی۔ اس نے نچلی منزل میں جو وزیٹنگ روم تھا۔ اس میں اپنی سہیلی کو سلائی کا سنٹر کھول دیا تھا۔

تاجی آپا نے تو اب ادھر کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا ۔ کہ ہوسٹل اس کے لیے ایک مستقل خلش بن کر رہ گیا تھا۔ مگر سکول بھی ہاتھوں سے نکل گیا۔

ہوسٹل تو کبھی کہیں اور بنایا بھی جا سکتا ہے۔ مگر سکول کی ساری راہیں بند پڑی ہیں۔ سکول یوں بھی اب میٹرک سے مڈل تک کا رہ گیا تھا۔ کیا خبر۔ عمارت کے مکین اپنا رہائشی معیار بدل لیں۔ اور عمارت اور بھی سکڑ کر رہ جائے۔ اور یہ سکول پرائمری تک رہ جائے۔

ہا ـــــ ۔۔

جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے تھے

تاجی آپا ـــ جس دن اپنے سارے رجسٹر نئی ہیڈ مسٹرس کو تھما کر سکول سے باہر نکلی ۔ تو عمارت پر گزوں لمبا پرچم لہرا رہا تھا۔

سبز حصہ اسلام کا ہے۔

سفید۔ امن کا۔

سیاہ ـــ اقلیت کی بھلائی ـ

سرخ ـــ مزدور کے لیے۔

میں مزدور بھی تھی۔ اور اس گھرانے میں اقلیت بھی (کہ صرف میری شادی نہ ہو سکی)

اس پرچم کا سایہ گھر اور سکول کے درمیان ایک لکیر سی بنا رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ اس لکیر کو پار کر کے جاؤں گی۔ تو اس ادارے سے اس کا سارا تعلق ختم ہو جائے گا۔

اس سے پہلے بھی وہ ایک پرچم کے سائے میں کھینچی لکیروں پر چلتی یہاں تک پہنچی تھی۔
جس نے اسے وطن دیا تھا۔
ہمت دی تھی۔
فخر دیا تھا۔
خاوند نہ ملا تو کیا ہوا —— سکول اس کا اقتصادی سہارا تھا۔ اور ہوسٹل نے اسے ڈھیر سی بچیاں دی تھیں۔ مگر پھر وہ جیسے بیوہ ہو گئی —— اور ساری بچیاں ساتھ چھوڑ گئیں۔ اب نہ بچیوں کا ساتھ ہے۔ نہ پیسے کا آسرا۔
یہ میری پناہ گاہ تھی ——
اب میں کہاں جاؤں ——
کدھر کو قدم اٹھاؤں ——
پرچم بہت بلند تھا۔
اس کا سایہ ایک لکیر میں ڈھل کر اس کی پناہ گاہ کی آخری حد بنا رہا تھا۔
جب وہ چھبیس برس قبل آئی تھی۔ تو نئے ملک میں داخل ہوتے ہوئے اس نے سرحد پر پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ نئے ملک میں آنے کی خوشی —— اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے وطن میں بسنے کے ارمان سے سرشار ——
مگر آج چھبیس برس کے بعد —— وہ تنہا تھی ——
بے سہارا تھی ——

ار مان ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ مایوسیوں نے دامن پھیلائے تھے ـــ

گز ون لمبا پرچم سکول کے چھت پہ لہرا رہا تھا۔ مگر اس پر اب کسی کا سایہ نہ تھا۔

میں کس وطن میں ہوں میرے خدا ـــ

اکبر ـــ سجاد تم کدھر ہو ـــ ادھر تو آؤ ـــ سنو تو۔

میری سیاست نے میری خدمت نے تمہیں
وطن دیا تھا۔ رہنے کو ٹھکانہ دیا تھا۔ پہننے
کو کپڑا ـــ اور کھانے کو روٹی دی تھی۔
اس وطن میں میں نے بغیر سرمایہ لگائے پیسہ
کمایا تھا۔ باعزت طور سے۔ اور تمہیں!
اقتصادی سہارا دیا تھا۔

مگر تم جو اپنی سیاست اپنی کارکردگی سے وزیروں کے برآمدہ نشین بن گئے ـ لوگوں پر سفارشوں کا رعب ڈال کر ان سے پیسہ بٹورنے کو ـــ مگر میرے سکول کو کالج بناتے بناتے مجھے یوں بے آسرا کر گئے ـ ذرا مجھے اپنے ان بڑے لوگوں سے پوچھ تو دو ـــ کہ اب میرا ٹھکانہ کہاں ہے ـــ ؟ میرے لیے انہوں نے کونسا سنٹر قائم کیا ہے ـ جہاں میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام باعزت طور پہ گذار سکوں ـــ

ادھر آؤ ـــ

مگر تاجی آپا کی آواز خلاؤں سے لوٹ آئی ـــ

ادھر تو آؤ — میری بات سنو —

اکبر —

سجاد —

اماں —

وہ اپنے اندر — ہی اندر سب کو پکارتے پکارتے تھک گئیں۔

وہ گھر کی دہلیز کے باہر "بے وطن"۔

تنہا مسافر کی طرح چپ چاپ کھڑی تھیں۔

پرائے دیس میں آکر جس کی جیب کٹ جائے۔ اور وہ راستہ بھول کر عزیزوں سے بچھڑ گیا ہو۔

ادبی معاشرتی ناول

ایک پہیلی :- رشید اختر ندوی - ضخامت - ۳۲۰ صفحات

ایک الھڑ دوشیزہ کی رقت آمیز داستان - قیمت ۵۰/۴ روپے

انکار :- عابدی جعفر - ضخامت :- ۳۲۸ صفحات

عشق و محبت کی دلآویز اور رنگین داستان کا نفسیاتی تجزیہ ۰/۷ روپے

دیدۂ تر :- عابدی جعفر - ضخامت ۳۹۲ صفحات

سماج کے تنگ نظر معاشرے کے لیے ایک سبق آموز ناول ۸/۰ روپے

دیوار :- عابدی جعفر - ضخامت - ۳۵۲ صفحات

سماج کی بنتی اور سنورتی اقدار کی ایک جیتی جاگتی تصویر ۵۰/۷ روپے

ساحل سے پہلے :- عابدی جعفر - ضخامت - ۳۶۰ صفحات

ایک رومان انگیز اور ولولہ خیز داستان - قیمت ۵۰/۷ روپے

محبت کے سوا :- عابدی جعفر - ضخامت :- ۳۸۴ صفحات

عشق و محبت کی طویل داستان کا نفسیاتی جائزہ - قیمت -/۸ روپے

مہیب سائے :- عابدی جعفر - ضخامت - ۳۵۲ صفحات

تحلیل نفسی کی کہانی عورت کی اپنی زبانی - قیمت ۸/۰ روپے

ہمزاد :- عابدی جعفر - ضخامت ۴۰۰ صفحات

رومان انگیز داستان کا نفسیاتی تجزیہ - قیمت ۸/۰ روپے

پل صراط :- سعیدہ مظہر - ضخامت ۳۸۴ صفحات

بھٹکتی ہوئی زندگیوں کے لیے مشعل راہ - قیمت ۸/۰ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز - پبلشرز - لاہور - حیدرآباد - کراچی

شیریں :- سعیدہ منظر - ضخامت :- ۳۵۰ صفحات
عورت کے تعصب کی روئداد ایک اچھوتے اور انوکھے انداز میں -/۸ روپے

نئی صبح :- سعیدہ منظر ضخامت :- ۳۵۰ صفحات
زندگی کے حسین نشیب و فراز کی مکمل تصویر - قیمت -/۸ روپے

بیتاب :- عذرا جمال - ضخامت ۴۶۴ صفحات
لکھنؤ کی دوشیزہ شوکت آرا کی عبرت انگیز داستان - قیمت -/۱۰ روپے

رسوائی :- عذرا جمال - ضخامت ۴۳۲ صفحات -
عجیب و غریب ناول جو خود رسوا ہو کر رہا قیمت -/۹ روپے

مارِ آستین :- عذرا جمال - ضخامت ۵۱۲
ایک دوست نما دشمن کی عبرت ناک کہانی - قیمت -/۱۰ روپے

یزدانی :- عذرا جمال - ضخامت ۳۹۸ صفحات
ایک مصور کی دلچسپ اور حسین و جمیل داستان - قیمت -/۸ روپے

پشیمانی :- عذرا جمال ضخامت ۴۳۲ صفحات
عشق و محبت کی رومان انگیز داستانیں - پیرایہ انداز نہایت دلکش -/۹

پھول اداس ہیں :- اے حمید - ضخامت ۲۵۶ صفحات
عشق و محبت کا المناک انجام - قیمت :- -/۶ روپے

حوادث :- غازی محمد اسحاق ضخامت ۲۸۸ صفحات
زندگی کی مسکراہٹوں کے ساتھ حادثات کی کش مکش -/۶ روپے

مسلے پھول :- کے زریں - ضخامت :- ۲۷۲ صفحات
ایسے بازار کی داستان جہاں طبلے کی تھاپ پر رقص ہوتے ہیں -/۷ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز - پبلشرز - لاہور - حیدرآباد - کراچی